آیت:35

﴿وَ قُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُکَ الْجَنَّۃَ وَ کُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۵﴾﴾

قُلْنَا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ اٰدَمُ (ء د م): البقرۃ آیت 31 دیکھیں۔

س ك ن

(ن) سُکُوْنًا: حرکت کے بعد ٹھہرنا۔ آرام کرنا۔ سکونت اختیار کرنا۔ آباد ہونا۔ ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِتَسْکُنُوْا فِیْهِ﴾ (10/یونس:67) ''وہ ہے جس نے بنایا تم لوگوں کیلئے رات کو تا کہ تم لوگ آرام کرو اس میں۔'' ﴿وَّ سَکَنْتُمْ فِیْ مَسٰکِنِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ﴾ (14/ابراہیم:45) ''اور تم لوگوں نے سکونت اختیار کی ان لوگوں کے مکانوں میں، جنہوں نے ظلم کیا اپنے آپ پر۔'' جب اِس کے ساتھ اِلٰی کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے سکون حاصل کرنا۔ ﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْۤا اِلَیْهَا﴾ (30/الروم:21) ''اور اُسی کی نشانیوں میں ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کی بیویاں بنائیں تا کہ تم اُن سے سکون حاصل کرو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

اُسْکُنْ: ج: اُسْکُنُوْا۔ فعل امر ہے ۔تو آرام کر۔تو سکونت اختیار کر۔ ﴿وَ اِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْکُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَۃَ﴾ (7/الاعراف:161) ''اور جب کہا گیا ان لوگوں سے کہ تم لوگ سکونت اختیار کرو اس بستی میں۔''

سَاکِنٌ: اسم الفاعل ہے۔ ٹھہرنے والا۔ ٹھہرا ہوا۔ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا ۚ﴾ (25/الفرقان:45) ''کیا تو نے دیکھا نہیں اپنے رب کی (قدرت کی) طرف کیسے اس نے پھیلایا سائے کو، اور اگر وہ چاہتا تو وہ بنا تا اس کو ٹھہرا ہوا۔''

مَسْکُوْنٌ: اسم المفعول ہے۔ واحد مذکر۔ آباد مکان کو کہتے ہیں جس میں کوئی رہتا ہو۔

مَسْکُوْنَۃٌ: اسم المفعول ہے۔ واحد مونث۔ آباد مکان۔ غَیْرُ مَسْکُوْنَۃٍ کا مطلب ہو گا غیر آباد مکان جس میں کوئی نہ رہتا ہو۔ ﴿لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْکُوْنَۃٍ فِیْهَا مَتَاعٌ لَّکُمْ ؕ﴾ (24/النور:29) ''تم پر کوئی گناہ اس میں نہیں ہے کہ تم اُن مکانات میں داخل ہو جاؤ (جن میں) کوئی رہتا نہ ہو اور اُن میں تمہارا کچھ مال ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

مَسْکَنٌ: ج: مَسَاکِنُ۔ اسم الظرف ہے۔ ٹھہرنے کی جگہ۔ مکان۔ ﴿لَقَدْ کَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْکَنِهِمْ اٰیَۃٌ ۚ﴾ (34/سبا:15) ''سبا والوں کے لیے اُن کے وطن ہی میں نشان موجود تھا۔'' اور مَسَاکِنُ کے لیے اوپر (ابراہیم:45) دیکھیں۔

سَکَنٌ: اسم ذات ہے۔ راحت۔ آرام۔ تسکین۔ ﴿اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّهُمْ ؕ﴾ (9/التوبہ:103) ''بیشک آپؐ کی دعا ان کیلئے باعث تسکین ہے۔'' مفتی محمد شفیعؒ سَکَنٌ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''سَکَن، سکون سے مشتق ہے، ہر ایسی چیز کو سَکَنٌ کہا جاتا ہے جس پر پہنچ کر انسان کو سکون واطمینان اور راحت حاصل ہو۔ اسی لیے انسان کے رہنے کے گھر کو قرآن میں سَکَن فرمایا ہے، جَعَلَ لَکُمْ مِّنْۢ بُیُوْتِکُمْ سَکَنًا، کیونکہ انسان کا گھر خواہ ایک جھونپڑی ہی ہو وہاں پہنچ کر انسان کو عادۃً سکون وراحت حاصل ہوتی ہے۔'' (معارف القرآن، ج ۴، ص ۴۰۰)

سَکِیْنَۃٌ: اسم ذات ہے۔ ایسا اطمینان اور سکون جس سے دل کو قرار آجائے اور ہر قسم کی تشویش کا خاتمہ ہو جائے۔ صاحبؒ لغات القرآن فرماتے ہیں: ''سَکِیْنَۃٌ وہ اطمینان، چین، قرار اور سکون ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندہ کے قلب میں اس وقت

نازل فرماتا ہے جب کہ وہ ہولناکیوں کی شدت سے مضطرب (بے قرار) ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد جو کچھ بھی اس پر گزرے وہ اس سے گھبراتا نہیں، یہ اس کے لیے ایمان کی زیادتی، یقین میں قوت اور استقلال کو ضروری کر دیتا ہے، اسی وجہ سے حق سبحانہ نے ''یوم الغار'' اور ''یوم حنین'' جیسے قلق واضطراب کے مواقع پر اپنے رسولؐ اور مومنین پر اس کے نازل کرنے کی خبر دی ہے۔'' (لغات القرآن، ج۳،ص ۲۱۹)۔ ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (48/الفتح:4) ''وہی ہے جس نے اتارا سکون مومنوں کے دلوں میں۔'' واضح رہے کہ قرآن مجید میں سَكِیْنَةٌ کا لفظ چھ جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس کے معنی اطمینان وسکون ہی کے ہیں۔'' (واللہ اعلم)

سِكِّیْنٌ اسم ذات ہے۔ چھری۔ چاقو۔ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں: ''اس کا نام سِكِّیْنٌ اس لیے ہوا کہ مذبوح (جس کو ذبح کیا جائے) کی حرکت کو زائل کر دیتی ہے۔ یہ سُكُوْنٌ سے بروزن فِعِّیْلٌ اسم مشتق ہے۔'' ﴿وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَـًٔا وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّیْنًا﴾ (12/یوسف:31) ''اور تیار کی اُن کے واسطے ایک مجلس اور دی اُن کو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(ک) **سُكُوْنَةً** متحرک نہ ہونا۔ محتاج ہونا (محتاجی انسان کو متحرک نہیں رہنے دیتی)۔

مَسْكَنَةٌ اسم ذات ہے۔ محتاجی۔ ﴿وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ (2/البقرہ:61) ''اور تھوپی گئی ان لوگوں پر ذلّت اور محتاجی۔''

مِسْكِیْنٌ ج: مَسَاكِیْنُ ۔اسم صفت ہے۔ مَنْ لَّا شَیْءَ لَهٗ۔ مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ محتاج۔ ضرورت مند۔ حدیثِ مبارک میں بڑی وضاحت کے ساتھ مسکین کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے۔ اَلَّذِیْ لَا یَجِدُ غِنًی یُّغْنِیْهِ وَلَا یُفْطَنُ بِهٖ فَیُتَصَدَّقُ عَلَیْهِ وَلَا یَقُوْمُ فَیَسْأَلُ النَّاسَ مسکین شخص وہ ہے جو اتنا بھی مال نہیں رکھتا کہ وہ اس کی وجہ سے مستغنی ہو اور اس کے ظاہری حالات کی وجہ سے لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ محتاج وضرورت مند ہے اسے صدقہ دیا جائے نیز لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنے کے لیے کھڑا بھی نہیں ہوتا۔'' (پوری حدیث کے لیے ملاحظہ ہو مظاہر حق جدید، شرح مشکوٰۃ شریف، ج۲،ص ۲۱۲)۔ ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ﴾ (17/بنی اسرائیل:26) ''اور تو دے قرابت والوں کو ان کا حق اور ضرورت مند کو۔'' ﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ﴾ (2/البقرہ:177) ''اور اس نے دیا مال اس کی محبت کے باوجود قرابت والوں کو اور یتیموں کو اور ضرورت مندوں کو۔''

(افعال) **اِسْكَانًا** (1) کسی کو بسانا۔ آباد کرنا۔ ﴿رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ﴾ (14/ابراہیم:37) ''اے ہمارے رب میں نے آباد کیا اپنی اولاد میں سے، ایسی وادی میں جو بغیر کھیتی والی ہے۔'' (2) کسی کو ٹھہرا دینا۔ ساکن کر دینا۔ ﴿اِنْ یَّشَاْ یُسْكِنِ الرِّیْحَ فَیَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰی ظَهْرِهٖ﴾ (42/الشوریٰ:33) ''اگر چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ جہاز سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

زَوْجٌ (ز و ج): البقرۃ آیت 25 دیکھیں۔ جَنَّةٌ (ج ن ن): البقرۃ آیت 25 دیکھیں۔

ء ك ل

(ن) **اَكْلًا** کسی چیز کو کھانا۔ اس کا استعمال مادی اور معنوی دونوں طرح سے ہوتا ہے۔ ﴿وَتَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ﴾ (12/یوسف:17) ''اور ہم نے چھوڑا یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس تو کھا گیا اس کو بھیڑیا۔'' ﴿وَیَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ﴾ (47/محمد:12) ''وہ کھاتے ہیں جیسے جانور کھاتے ہیں۔''

كُلْ — تثنیہ: كُلَا۔ جمع: كُلُوْا۔ واحد مونث: كُلِيْ۔ فعل امر ہے۔ تو کھا۔ ﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ ﴾ (2/البقرہ:58) ''تو تم لوگ کھاؤ اس میں سے جہاں سے تم لوگ چاہو۔''

اٰكِلٌ — ج: اٰكِلُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ کھانے والا۔ ﴿ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴾ (23/المومنون:20) ''وہ اگاتا ہے تیل اور سالن کھانے والوں کے لیے۔'' ﴿ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴾ (37/الصافات:66) ''جہنّم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے۔''

مَاْكُوْلٌ — اسم المفعول ہے۔ کھایا ہوا۔ ﴿ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ﴾ (105/الفیل:5) ''تو اس نے کر دیا ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند۔''

اَكَّالٌ — اسم المبالغہ ہے۔ بہت کھانے والا۔ ﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ﴾ (5/المائدہ:42) ''بہت زیادہ سننے والے جھوٹ کو، بہت زیادہ کھانے والے حرام کو۔''

اُكُلٌ — اسم ذات ہے۔ درختوں اور پودوں کی پیداوار کا وہ حصہ جو انسان کی خوراک بنے۔ پھل، میوہ۔ ﴿ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ﴾ (2/البقرہ:265) ''پہنچی اس کو موٹی بوندوں والی بارش تو اس نے دیا اپنا پھل دوگنا۔''

ر غ د

(س) رَغَدًا — آسودہ و خوش حال ہونا۔

رَغَدٌ — اسم صفت ہے۔ بافراغت۔ کھلا ''وہ نعمت اور رزق جس کے حاصل کرنے میں کوئی محنت اور مشقت نہ ہو اور وہ اتنی کثیر ہو کہ اس کے ختم ہونے کا اندیشہ بھی نہ ہو'' (معارف القرآن) ﴿ يَاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ ﴾ (16/النحل:112) ''آتا اس کو یعنی بستی کو اس کا رزق بافراغت ہر طرف سے۔''

حَيْثُ

حَيْثُ ظرف مکان ہے اور مبنی برضمہ ہے۔ معنیٰ ہوتا ہے ''جہاں سے''، ''جس جگہ سے'' وغیرہ۔ زیادہ تر مکان مبہم (غیر واضح جگہ) کے لیے آتا ہے اس لیے کسی جملے سے اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ حَيْثُ کے ایک معنیٰ ''اہل'' کے بھی ہیں۔ حضرت مولانا عبدالماجدؒ، سورۃ الانعام کی آیت 124 کا ترجمہ کرتے ہیں: ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ ''اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اُس کی رسالت کا اہل ہے'' اور حاشیے میں فرماتے ہیں: ''حَيْثُ یہاں بطور ظرف کے موضع و موقع کے معنی میں نہیں۔ بطور اسم کے اہل کے معنی میں ہے۔'' (نوٹ: ح ی ث مادہ سے کوئی فعل استعمال نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم)

شِئْتُمَا (ش ی ء): البقرۃ آیت 20 دیکھیں۔

ق ر ب

(س۔ک) قُرْبًا، قُرْبَانًا — کسی کے نزدیک جانا (س)۔ کسی کے قریب ہونا (ک)۔ قرب کا استعمال قرآنِ مجید میں کہیں باعتبار مکان کے ہوا ہے، کہیں باعتبار زمان کے، کہیں باعتبار نسب کے اور کہیں باعتبار درجہ کے ہوا ہے۔ بندہ سے اللہ کے قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنے فضل و رحمت سے متوجہ ہے۔ قرب کا لفظ بطور کنایہ، ہم بستری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ثلاثی مجرد سے ماضی معروف اور مضارع معروف کے صیغے استعمال نہیں ہوئے، البتہ مصدر قُرْبَانًا استعمال ہوا ہے۔ ﴿ فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ﴾ (46/الاحقاف:28) ''سو اُن کی مدد اُن لوگوں نے کیوں نہ کی جنہیں اُنہوں نے اللہ کے سوا معبود بنا رکھا تھا تقرب کے لیے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

لَا تَقْرَبْ — فعل نہی ہے۔ تو قریب مت جا۔ ﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ﴾ (2/البقرہ:187) ''یہ اللہ کی حدود ہیں تو تم لوگ

ان کے نزدیک مت جاؤ۔'' قرآن مجید میں جہاں کہیں لَا تَقْرَبُوْا کے الفاظ آئے ہیں وہاں قرب سے قرب مکانی مراد ہے۔

اَقْرَبُ ج:اَقْرَبُوْنَ۔افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔زیادہ قریب۔زیادہ نزدیک۔قریب کے رشتے دار۔﴿ وَلَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ﴾(4/النساء:11)''اور تم لوگ نہیں جانتے کہ ان میں سے کون زیادہ قریب ہے تمہارے بلحاظ نفع کے۔''﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ﴾(4/النساء:7)''مردوں کا بھی حصہ ہے اُس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔اس آیت میں اَقْرَبُوْنَ کی وضاحت کرتے ہوئے مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''لفظ اَقْرَبُوْنَ ہر قسم کی قرابت اور رشتہ داری کو حاوی ہے، خواہ وہ رشتہ باہمی ولادت کا ہو جیسے اولاد اور ماں باپ میں، یا دوسری طرح کا جیسے عام خاندانی رشتوں میں، یا وہ رشتے جو ازدواجی تعلق سے پیدا ہوئے ہیں، لفظ ''اَقْرَبُوْنَ'' سب پر حاوی ہے۔''(معارف القرآن، ج۲،ص۳۱۰)

قُرْبٰی اَقْرَبُ کا مونث ہے۔زیادہ قریب۔زیادہ نزدیک۔قرابت والے۔﴿ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ﴾(6/انعام:152)''اور جب بھی تم بولو تو انصاف کرو اگرچہ وہ ہو قرابت والا۔''

قَرِيْبٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔قریب۔نزدیک۔﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ﴾(2/البقرہ:186)''اور جب آپؐ سے پوچھیں میرے بندے میرے بارے میں تو یقینا میں نزدیک ہوں۔'' قریب واحد و جمع سب کے لیے آتا ہے، لفظ مذکر ہے لیکن مؤنث غیر حقیقی پر بھی اس کا اطلاق صحیح ہے، جیسے اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔

مَقْرَبَةٌ (ا) مصدر میمی ہے۔قرابت ہونا۔(ب) اسم ہے۔قرابت۔رشتہ دار۔﴿ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴾(90/البلد:15)''کسی رشتے دار یتیم کو۔''

قُرْبَةٌ ج:قُرُبَاتٌ۔اسم ذات ہے۔قرب حاصل کرنے کا ذریعہ۔نزدیک ہونے کا ذریعہ۔﴿ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ ﴾(9/التوبہ:99)''اور بعض اہل دیہات میں ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو عند اللہ قرب حاصل ہونے کا ذریعہ اور رسولؐ کی دعا کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یاد رکھو کہ ان کا یہ خرچ کرنا بیشک ان کے لیے موجب قربت ہے۔''(ترجمہ احسن البیان)

قُرْبَانٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے لغوی معنی کے لحاظ سے قربان ہر وہ چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے۔ خواہ یہ قرب کسی جانور کو اللہ کی راہ میں ذبح کر کے حاصل کیا جائے یا اس کی راہ میں صدقہ و خیرات کر کے یا اعمال صالح کے ذریعے سے، جیسے ایک حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے فرائض کی ادائیگی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔(اربعین نوویؒ، حدیث نمبر38)۔اصطلاحی معنی کے لحاظ سے قربان اس ذبیحہ کو کہا جاتا ہے جو اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے ذبح کیا جائے اور اردو زبان میں یہی مفہوم عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔قرآن مجید میں یہ لفظ اپنے لغوی اور اصطلاحی دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ ﴾(3/آل عمران:183)''بیشک اللہ نے ہم سے عہد لیا کہ ہم بات نہ مانیں گے کسی رسول کی یہاں تک کہ وہ آئے ہمارے پاس کسی ایسی قربانی کے ساتھ، کھاتی ہو جس کو آگ۔''﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا ﴾(5/المائدۃ:27)''آدمؑ کے دونوں بیٹوں کا کھرا کھرا حال بھی اُنہیں سنا دو، اُن دونوں نے ایک نذرانہ پیش

کیا۔'' (ترجمہ احسن البیان) اس آیت کے تحت حضرت مولانا عبدالماجدؒ فرماتے ہیں: ''قُرْبَانًا: قربانی یہاں اصطلاحی معنیٰ میں یعنی ذبیحہ کے مرادف نہیں۔ بلکہ لفظی معنیٰ اور وسیع مفہوم میں ہے، نذر و نیاز کے مفہوم میں ہے۔'' قربان کا لفظ واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے اور اس کی جمع قَرَابِیْنُ بھی آتی ہے۔ قرآن مجید میں قربان کا لفظ مصدری معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے جس کی مثال پہلے آ چکی ہے۔

(تفعیل) تَقْرِیْبًا کسی کو کسی کے نزدیک کرنا۔ پیش کرنا۔ ﴿فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ ۙ﴿۲۶﴾ فَقَرَّبَهٗۤ اِلَیْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۚ﴿۲۷﴾﴾ (51/الذّٰریٰت:26-27) ''تو وہ لایا ایک موٹا بچھڑا پھر اس نے قریب کیا اس کو، ان کے یعنی فرشتوں کے، کہا تم لوگ کھاتے کیوں نہیں۔''

مُقَرَّبٌ ج: مُقَرَّبُوْنَ۔ اسم المفعول ہے۔ قریب کیا ہوا۔ ﴿قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ﴿۱۱۴﴾﴾ (7/الاعراف:114) ''اس نے یعنی فرعون نے کہا ہاں اور یقیناً تم لوگ قریب کئے ہوئے لوگوں میں ہو گے۔''

(افتعال) اِقْتِرَابًا قریب ہونا۔ ﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ﴾ (21/الانبیاء:1) ''قریب ہوا لوگوں کے لئے ان کا حساب۔''

اِقْتَرِبْ فعل امر ہے۔ تو قریب ہو جا۔ ﴿كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾ ۩﴾ (96/العلق:19) ''خبردار! اس کا کہنا ہرگز نہ ماننا اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔''

ش ج ر

(ن) شَجْرًا، شُجُوْرًا باہم مختلف ہونا۔ جھگڑنا۔

شَجَرٌ اسم ذات ہے۔ (1) تنے والا درخت (کیونکہ درخت کی شاخیں مختلف سمت میں پھیلتی ہیں شاید اسی لیے شجر کہلاتا ہے) (واللہ اعلم)۔ درخت کی جنس کے لیے شَجَرٌ۔ ایک درخت کے لیے شَجَرَةٌ جبکہ جمع اَشْجَارٌ ہے۔ ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا﴾ (36/یٰسٓ:80) ''جس نے بنایا تمہارے لیے سبز درخت سے آگ کو۔'' عربی زبان میں شجر کا لفظ صرف درخت کے لیے نہیں بولا جاتا بلکہ اس کے مفہوم میں پودے، جھاڑیاں، گھاس سب داخل ہیں۔ چنانچہ سورۃ النحل کی آیت 10 میں فرمایا ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ﴿۱۰﴾﴾ حضرت مولانا عبدالماجدؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: ''وہ اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا جس سے تمہیں پینے کو ملتا ہے اور اُسی سے سبزہ زار پیدا ہوتے ہیں جن میں تم مویشی چراتے ہو۔'' اور پیر کرم شاہ صاحبؒ ترجمہ کرتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے اتارا آسمان سے پانی تمہارے لیے اُس میں سے کچھ پینے کے کام آتا ہے اور اُس سے سبزہ اگتا ہے جس میں تم مویشی چراتے ہو۔'' اس آیت کے حاشیے میں حضرت مولانا عبدالماجدؒ فرماتے ہیں: ''شجر کے عموم میں پودے، درخت، جھاڑیاں، گھاس سب داخل ہیں۔ یہاں مراد چراگاہیں ہیں۔'' اور پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''یہاں شجر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو زمین سے اُگتی ہے۔ ابن قتیبہؒ نے کہا ہے کہ شجر سے مراد یہاں گھاس ہے۔'' اور مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''لفظ شجر اکثر درخت کے لیے بولا جاتا ہے، جو ساق یعنی تنے پر کھڑا ہوتا ہے، اور کبھی مطلق زمین سے اُگنے والی ہر چیز کو بھی شجر کہتے ہیں، گھاس اور بیل وغیرہ بھی اس میں داخل ہوتی ہیں، اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں، کیونکہ آگے جانوروں کے چرانے کا ذکر ہے اس کا تعلق زیادہ تر گھاس ہی سے ہے۔''

(2) اختلاف۔ جھگڑا۔ ﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ﴾ (4/النساء:65) ''(پس

نہیں! تیرے رب کی قسم، یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپؐ کو حاکم تسلیم کرلیں اس میں جس میں جھگڑا ہے ان کے مابین۔''

اَلظّٰلِمِیْنَ (ظ ل م): البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔

ترکیب 'و' استئنافیہ ہے۔ قُلْنَا فعل ماضی ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحْنُ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ یَا۔ حرف ندا ہے اور اٰدَمُ۔ منادیٰ ہے۔ اُسْکُنْ فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتَ کی ضمیر ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُسْکُنْ کے اندر اَنْتَ کی ضمیر موجود ہے پھر ایک اور اَنْتَ کی ضمیر آگے کیوں آئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اُسْکُنْ کی ضمیر فاعلی کی تاکید کے لیے آئی اور اس کے بعد 'و' عطف کا ہے اور آگے زوج اسم ہے اور عطف کا قاعدہ یہ ہے کہ اسم کا اسم پر، فعل کا فعل پر اور جملے کا جملے پر عطف ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں زَوْجُكَ کا عطف، فعل اُسْکُنْ پر نہیں ہوسکتا اس لیے اُسْکُنْ کی ضمیر فاعلی کو الگ سے لکھا گیا۔ اس کی اور مثالیں بھی قرآن مجید میں دیکھی جاسکتی ہیں مثلاً المائدہ۔24، ابراہیم:8 وغیرہ۔ (اس قاعدے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عربی کا معلم حصہ چہارم، ص:163 ''المعطوف'')۔ اَلْجَنَّةَ۔ اُسْکُنْ کا مفعول ہونے کی وجہ سے نصب میں ہے۔ آگے 'و' پھر عطف کا ہے اور کُلَا فعل امر میں تثنیہ کا صیغہ ہے اور کُلَا اُسْکُنْ پر عطف ہے۔ مِنْهَا میں 'ھا' ضمیر اَلْجَنَّةَ کے لیے ہے۔ رَغَدًا۔ صفت ہے محذوف مفعول مطلق کی یعنی وَكُلَا مِنْهَا اَكْلًا رَغَدًا۔ حَيْثُ۔ ظرف مکان ہے اور شِئْتُمَا۔ ماضی میں تثنیہ کا صیغہ ہے۔ آگے پھر 'و' عطف کا ہے اور لَا تَقْرَبَا۔ فعل نہی ہے اور اس کا عطف ''کُلَا'' پر ہے۔ هٰذِهِ الشَّجَرَةَ مرکب اشاری اور لَا تَقْرَبَا کا مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ فَتَكُوْنَا میں 'ف' سببیہ ہے اسی لیے تَكُوْنَا منصوب ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عربی کا معلم حصہ چہارم، ص: 75)۔ تَكُوْنَا کا اسم اس میں شامل ضمیر اَنْتُمَا ہے۔ خبر محذوف ہے اور مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ متعلق خبر ہے۔ علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''میرے نزدیک فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ کا ترجمہ اگر یوں کیا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا ''پھر ہوجاؤ گے تم نقصان اٹھانے والوں میں سے''۔ ظلم کے معنی نقصان، کمی و کوتاہی کے آتے ہیں۔ جیسا کہ وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا (کہف) میں۔ (تفسیر عثمانیؒ، الاعراف۔19 کے تحت)۔

ترجمہ
البقرۃ:35

وَقُلْنَا	يٰٓاٰدَمُ	اسْكُنْ	اَنْتَ وَزَوْجُكَ	الْجَنَّةَ
اور ہم نے کہا	اے آدمؑ	تم رہو	تم بھی اور تمہاری بیوی بھی	اس جنت میں

وَكُلَا	مِنْهَا	رَغَدًا	حَيْثُ شِئْتُمَا ۪
اور تم دونوں کھاؤ	اس میں سے	جی بھر کے	جہاں سے تم دونوں چاہو

وَلَا تَقْرَبَا	هٰذِهِ الشَّجَرَةَ	فَتَكُوْنَا
اور تم دونوں نزدیک مت جانا	اس درخت کے	ورنہ تم دونوں ہوجاؤ گے

مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۵﴾
نقصان اٹھانے والوں میں سے

نوٹ:1 سورہ آلِ عمران کی آیت نمبر۔7 میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں محکمات بھی ہیں اور متشابہات بھی ہیں۔ اور وہی لوگ متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں محکم اور متشابہ، دونوں پہلو شامل ہیں۔ محکم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک حکم دیا تھا جس کی

پابندی نہیں کی گئی۔متشابہ بات یہ ہے کہ وہ درخت کس چیز کا تھا۔

قرآن مجید سے راہنمائی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ طالبعلم اپنی توجہ کو اس بات پر مرتکز کرے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرنے کا کیا نتیجہ نکلا اور اس سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے۔اگر طالبعلم اس جستجو میں لگے گا کہ وہ درخت کس چیز کا تھا،تو اس کا حاصل کچھ نہیں ہے۔البتہ اصل سبق سے اس کی توجہ ہٹ جائے گی اور وہ ہدایت سے محروم رہے گا۔(از لطف الرحمن خان صاحب)

آیت:36

﴿ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝٣٦ ﴾

ز ل ل

(ض) زَلَّةً، زَلًّا بلا ارادہ پھسل جانا۔لغزش ہوجانا۔بلا ارادہ گناہ ہو جانا۔﴿ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ ﴾ (2/البقرہ:209)''پھر اگر لغزش ہوجائے تم لوگوں سے اس کے بعد جو آئیں تمہارے پاس روشن دلیلیں۔''﴿ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا ﴾ (16/النحل:94)''اور نہ بناؤ اپنی قسموں کو آپس میں فریب دینے کا ذریعہ ورنہ (جادۂ حق سے) پھسل جائے گا (لوگوں کا) قدم (اس پر) جم جانے کے بعد۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)

(افعال) اِزْلَالًا کسی کو پھسلا دینا۔آیت زیر مطالعہ۔

(استفعال) اِسْتِزْلَالًا کسی کو پھسلانے کا ارادہ کرنا۔کوشش کرنا۔﴿ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ ﴾(3/آل عمران:155) ''بیشک بہکا دیا ان کو شیطان نے بسبب بعض چیزوں کے جو انہوں نے کمائیں۔''

اَلشَّيْطٰنُ(ش ط ن، ش ی ط): اعوذ باللہ دیکھیں۔ اَخْرَجَ(خ ر ج): البقرۃ آیت 22 دیکھیں۔
قُلْنَا(ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

ھ ب ط

(ض) هُبُوْطًا، هَبْطًا هُبُوْطٌ اور هَبْطٌ کئی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً بلندی سے نیچے اترنا جیسے آیت زیر مطالعہ میں فرمایا:﴿ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ ﴾۔گر پڑنا جیسے فرمایا:﴿ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ ﴾(2/البقرہ:74)''اور یقیناً ان پتھروں میں وہ بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے۔''مسافر کا سواری سے کسی منزل پر اترنا جیسے فرمایا:﴿ قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ ﴾(11/ھود:48)''ارشاد ہوا اے نوحؑ (کشتی سے) اترئیے امن وسلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے ساتھ جو آپؑ پر ہیں اور اُن قوموں پر جو آپ کے ہمراہ ہیں۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔کسی شہر میں داخل ہونا جیسے فرمایا:﴿ اهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ ﴾ (2/البقرۃ:61)''اچھا شہر میں جاؤ وہاں تمہاری چاہت کی سب چیزیں ملیں گی۔''(ترجمہ احسن البیان)۔اس آیت میں اِهْبِطُوْا کی وضاحت کرتے ہوئے صاحبؒ تدبر قرآن فرماتے ہیں:''هَبَطَ کے اصلی معنی گرنے کے ہیں اور استعمال میں یہ کسی مسافر کے کسی منزل میں اترنے کے لیے بھی آتا ہے مثلاً کہیں گے هَبَطْنَا الْوَادِیْ (ہم وادی میں داخل ہوئے) یہیں

سے اِهْبِطُوْا مِصْرًا کا محاورہ رائج ہوا اور هُبُوْط کا لفظ نزول کے مرادف کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ اس استعمال کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہوگی کہ مسافر جب کسی مقام پر قیام کا ارادہ کرتا ہے تو وہاں وہ اپنے مرکب سے اترتا ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۲۲۵)۔ کسی چیز کو کم کر دینا، گھٹا دینا۔ عربی میں کہتے ہیں هَبَطَ الْمَرَضُ لَحْمَ الْعَلِيْلِ بیماری نے اس کے گوشت کو کم کر دیا اور اَلْهَبِيْطُ کمزور اور لاغر اونٹ کو کہتے ہیں۔ یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ هُبُوْط یا هَبْط کا لفظ جب انسان یا جن کے لیے بولا جائے تو اس میں حقارت کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴾ (7/الاعراف:13) ''حق تعالیٰ نے فرمایا تو آسمان سے اتر تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو آسمان میں رہ کر تکبر کرے سو نکل، بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔

اِهْبِطْ تثنیہ: اِهْبِطَا۔ ج: اِهْبِطُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو اُتر۔ اِهْبِطْ کے لیے اوپر الاعراف۔13 دیکھیں۔ ﴿ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ﴾ (20/طٰہٰ:123) ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم دونوں جہاں سے اتر جاؤ سب کے سب تم میں سے بعض، بعض کے دشمن ہیں۔'' اور اِهْبِطُوْا آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے۔

بَعْضٌ (ب ع ض): البقرۃ آیت 26 دیکھیں۔

ع د و

(ن) **عَدْوًا** حد سے تجاوز کرنا۔ ظلم و زیادتی کرنا۔ دشمنی کرنا۔ اگر اس کا تعلق چلنے سے ہو تو مطلب ہوتا ہے دوڑنا کیونکہ دوڑنا، چلنے سے تجاوز ہی ہے۔ ﴿ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ ﴾ (7/الاعراف:163) ''جب انہوں نے حد سے تجاوز کیا ہفتہ کے دن میں۔'' ﴿ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ﴾ (10/یونس:90) ''تو ان کا پیچھا کیا فرعون نے اور اس کے لشکروں نے سرکشی اور ظلم کرتے ہوئے۔'' ﴿ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ (6/الانعام:108) ''تو وہ برا کہیں گے اللہ کو زیادتی کرتے ہوئے کسی علم کے بغیر۔''

لَا تَعْدُ فعل نہی ہے۔ تو حد سے مت بڑھ۔ ﴿ وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ ﴾ (4/النساء:154) ''اور ہم نے کہا ان سے تم لوگ حد سے مت بڑھو ہفتہ کے دن میں۔''

عَادٍ ج: عَادُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ حد سے بڑھنے والا۔ ﴿ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ (2/البقرہ:173) ''پس جو مجبور ہوا، نہ سرکشی کرنے والا نہ حد سے بڑھنے والا، تو کوئی گناہ نہیں اس پر۔'' ﴿ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴾ (23/المومنون:7) ''پس جو چاہے اس سے آگے تو وہ لوگ ہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔''

عَادِيَةٌ ج: عَادِيَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ بڑی تیزی سے دوڑنے والی۔ قرآن مجید میں اس کی جمع گھوڑوں کی صفت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً: ﴿ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ﴾ (100/العادیات:1) ''قسم ہے تیز دوڑنے والے گھوڑوں کی جب وہ سینہ سے آواز نکالتے ہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

عَدُوٌّ اسم صفت ہے۔ دشمن۔ واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کی جمع اَعْدَاءٌ بھی آتی ہے۔ ﴿ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ (2/البقرہ:168) ''اور تم لوگ پیروی مت کرو شیطان کے نقش قدم کی بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' ﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ

عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ ﴾ (2/البقرۃ:98) ''جو شخص اللہ کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کے رسولوں کا اور جبریلؑ اور میکائیلؑ کا دشمن ہو تو بے شک اللہ تعالیٰ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔'' ﴿ وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ ﴾ (41/حم السجدہ:19) ''اور جس دن ہانکے جائیں گے اللہ کے دشمن آگ کی طرف۔'' واضح رہے کہ یہ لفظ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے (جیسے اوپر البقرۃ۔98) اور بندے کے لیے بھی۔ بندے کی دشمنی اللہ سے یہ ہے کہ اللہ کے احکامات کی نافرمانی کرے اور اس کے رسولوں، فرشتوں اور اولیاء اللہ سے دشمنی رکھے اور اللہ کی دشمنی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ایسے شخص کو اس کے گناہ پر سزا دے گا اور اس کی مغفرت نہیں کرے گا۔ عَدُوٌّ کی قسمیں بھی دو ہیں۔ ایک دشمنی وہ ہے جو کوئی قصد اور اِرادہ کے ساتھ کسی سے رکھے جیسے فرمایا ﴿ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ ﴾ (الانعام:112) یا فرمایا ﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾ ﴾ (بنی اسرائیل:53) اور دوسری دشمنی وہ ہے کہ جس میں قصد و ارادہ کا دخل تو نہ ہو لیکن اس دشمنی کی حالت ایسی ہو کہ جس کی وجہ سے کسی شخص کو ویسی ہی تکلیف پہنچے جیسی کہ دشمنوں سے پہنچتی ہے مثلاً فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ ﴾ (التغابن:14) بعض بیویوں اور اولاد کو جو دشمن قرار دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ آدمی بیوی بچوں کی محبت اور فکر میں پھنس کر اللہ اور اس کے احکامات کو بھلا دیتا ہے جس کا آخری انجام نقصان اور خسارے کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ جو اہل و عیال اتنے بڑے نقصان کا سبب بنیں وہ حقیقتاً دوست نہیں بلکہ دشمن ہیں۔ (واللہ اعلم)۔

عَدَاوَةٌ اسم ذات ہے۔ دشمنی۔ اس کا تعلق دل کی کیفیت سے ہے۔ یعنی باہمی ہم آہنگی نہ ہونا۔ ﴿ وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ ﴾ (5/المائدہ:64) ''اور ہم نے ڈال دی ان کے مابین دشمنی اور بغض قیامت کے دن تک کے لیے۔''

عُدْوَانٌ اسم ذات ہے۔ زیادتی۔ ظلم۔ عُدْوَانٌ وہ ظلم ہے جو عدل نہ کرنے سے ہوتا ہے۔ ﴿ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ ﴾ (5/المائدہ:2) ''اور تم لوگ تعاون مت کرو گناہ اور زیادتی پر۔''

عُدْوَةٌ اسم ذات ہے۔ کسی چیز کی حد۔ کنارہ۔ ﴿ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا ﴾ (8/الانفال:42) ''جب تم لوگ تھے نزدیکی کنارے پر۔''

(مفاعلہ) مُعَادَاةً اور عِدَاءً باہم جھگڑا کرنا۔ کسی سے دشمنی رکھنا۔ ﴿ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ ﴾ (60/الممتحنۃ:7) ''قریب ہے کہ اللہ پیدا کر دے تمہارے مابین اور ان کے مابین جن سے تمہارا جھگڑا ہے، ان میں سے کچھ کے، محبت۔''

(تفعّل) تَعَدٍّ کوشش کر کے تجاوز کرنا۔ جانتے بوجھتے تجاوز کرنا۔

يَتَعَدَّ مضارع مجزوم ہے۔ ﴿ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا ﴾ (4/النساء:14) ''اور جس نے نافرمانی کی اللہ اور اس کے رسول کی اور تجاوز کیا اس کی حدود سے تو وہ داخل کرے گا اس کو آگ میں۔''

(افتعال) اِعْتِدَاءً اہتمام سے تجاوز کرنا۔ زیادتی کرنا۔ ﴿ وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ ﴾ (2/البقرہ:65) ''اور تم لوگ جان چکے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تجاوز کیا تم میں سے ہفتہ کے دن میں۔'' ﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ ﴾ (2/البقرہ:178) ''پس جو زیادتی کرے اس کے بعد تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

اِعْتَدِ ج: اِعْتَدُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو زیادتی کر۔ ﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ ﴾ (2/البقرہ:194) ''پس جس نے زیادتی کی تم لوگوں پر تو تم لوگ زیادتی کرو اس پر، اس کی مانند جو اس نے زیادتی کی تم پر۔''

مُعْتَدٍ ج: مُعْتَدُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ حد سے بڑھنے والا۔ زیادتی کرنے والا۔ ﴿مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۙ﴾ (50/قٓ:25) ''جو نیک کام سے روکنے والا، حد سے گزرنے والا اور شک کرنے والا تھا۔'' ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝﴾ (2/البقرہ:190) ''بیشک اللہ پسند نہیں کرتا زیادتی کرنے والوں کو۔''

اَلْاَرْضُ (ء ر ض): البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

ق ر ر

(ض۔س)(ل) قُرًّا اور قُرُوْرًا کسی چیز کا ٹھنڈا ہو کر جم جانا۔ ٹھنڈا ہونا۔ ٹھنڈا رکھنا (لازم و متعدی) ﴿فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا﴾ (20/طٰہٰ:40) ''تو ہم نے لوٹایا آپؑ کو (یعنی موسیٰؑ کو) آپؑ کی والدہ کی طرف تاکہ ٹھنڈی ہو اس کی آنکھ۔''

(ب) قَرَارًا ٹھہرنا۔ ﴿وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ۝﴾ (23/مومنون:50) ''اور ہم نے ابن مریمؑ اور اُن کی والدہ کو ایک بڑا نشان بنایا اور ہم نے اُن دونوں کو بلند زمین پر پناہ دی جو ٹھہرنے کے قابل اور شاداب تھی۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

قَرِّ فعل امر ہے۔ تو ٹھنڈا رہ۔ ٹھنڈا رکھ۔ تو ٹھہر۔ ﴿فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا﴾ (19/مریم:26) ''پس تو کھا اور تو پی اور تو ٹھنڈی رکھ آنکھ۔'' (قَرِّيْ، واحد مؤنث حاضر کا صیغہ ہے)۔ ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ (33/الاحزاب:33) ''اور تم ٹھہری رہو اپنے گھروں میں۔'' (قَرْنَ، جمع مؤنث حاضر کا صیغہ ہے)۔

قَرَارٌ (1) اسم ذات بھی ہے۔ مطلب ہے ٹھہراؤ۔ ﴿وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝﴾ (14/ابراہیم:26) ''اور مثال گندی بات کی جیسے درخت گندہ اُکھاڑ لیا اُس کو زمین کے اُوپر سے کچھ نہیں اُس کو ٹھہراؤ۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(2) اسم ظرف ہے۔ مطلب ہے ٹھہرنے کی جگہ۔ ٹھکانہ۔ مقام۔ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝﴾ (23/المومنین:13) ''پھر ہم نے اُسے نطفہ بنایا ایک محفوظ مقام میں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ﴿جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝﴾ (14/ابراہیم:29) ''جہنم جس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔''

قُرَّةٌ اسم ذات ہے۔ ٹھنڈک۔ ﴿وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ﴾ (25/الفرقان:74) ''اور یہ وہ لوگ ہیں جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ﴿وَ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَ لَكَ ۭ﴾ (28/القصص:9) ''اور فرعون کی بیوی نے کہا یہ تو میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔'' یہاں اس آیت مبارکہ میں قُرَّةٌ کو لمبی 'ت' کے ساتھ لکھا گیا ہے (واللہ اعلم)۔

قَارُوْرَةٌ ج: قَوَارِيْرُ۔ شیشہ۔ ﴿قَوَارِيْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ﴾ (76/الدھر:16) ''چاندی کے شیشے۔'' چاندی کے قواریر ہونے کا یہ مطلب ہے کہ چاندی کی طرح سفیدی اور شیشے کی طرح صفائی ان برتنوں میں ہوگی۔

(افعال) اِقْرَارًا (1) کسی کو ٹھہرانا۔ (2) کسی بات کا اقرار کرنا۔ ﴿وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ﴾ (22/الحج:5) ''اور ہم ٹھہراتے ہیں رحموں میں جو ہم چاہتے ہیں۔'' ﴿قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا﴾ (3/آل عمران:81) ''ان لوگوں نے کہا ہم نے اقرار کیا، اس نے کہا تو تم لوگ گواہ رہو۔''

(استفعال) اِسْتِقْرَارًا ٹھہرے رہنا۔ قرار پکڑنا۔ ﴿وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ﴾ (7/الاعراف:143)

''لیکن تو دیکھ پہاڑ کی طرف پس اگر وہ ٹھہرا رہا اپنی جگہ پر تب تو دیکھے گا مجھ کو۔''

مُسْتَقِرٌّ اسم الفاعل ہے۔قرار پکڑنے والا۔ٹھہرنے والا۔﴿ وَ لَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴾(54/القمر:38)''اور ان پر صبح تڑکے آچکا ہے ٹھہرنے والا عذاب۔''

مُسْتَقَرٌّ اسم المفعول ہے جو ظرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ٹھہرنے کی جگہ۔ٹھکانہ۔مقررہ وقت۔﴿ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمُسْتَقَرُّ ﴾(75/القیٰمہ:12)''تیرے رب کی طرف اس دن ٹھہرنے کی جگہ ہے۔''﴿ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۙ وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴾(6/الانعام:67)''ہر خبر کے وقوع کا ایک وقت معین ہے اور تمہیں معلوم ہی ہو کر رہے گا۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔اس آیت میں مُّسْتَقَرٌّ کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''مُّسْتَقَرٌّ کے لفظی معنی تو ہیں جائے وقوع واستقرار کے لیکن یہاں مراد وقت وقوع واستقرار ہے،بعض نے دونوں معنیٰ جائز رکھے ہیں۔''

م	ت	ع

(ف) **مُتُوْعًا** کسی چیز کا بڑھنا۔بلند ہونا۔

مَتَاعٌ ج: اَمْتِعَةٌ۔سامانِ زندگی میں سے ہر وہ چیز مَتَاعٌ کہلاتی ہے جس سے انسان یا کوئی جاندار اپنے زندہ رہنے کے لیے فائدہ اٹھائے۔ہر وہ چیز جس سے فائدہ اٹھایا جائے اور پھر وہ فنا ہو جائے۔عارضی سامان۔﴿ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ ﴾(4/النساء:77)''آپؐ کہہ دیجیے کہ دنیا کا سامان تھوڑا ہے۔''﴿ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ ﴾(4/النساء:102)''چاہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ اگر تم لوگ غافل ہو اپنے ہتھیاروں سے اور اپنے سامان سے۔''

(تفعیل) **تَمْتِيْعًا** لمبا کرنا یا بلند کرنا۔کسی دوسرے کو ایسا سامانِ دنیا دینا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکے۔فائدہ پہنچانا۔﴿ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ ﴾(25/الفرقان:18)''اور لیکن تو نے عرصہ دراز تک فائدہ اٹھانے دیا ان کو اور ان کے باپ دادا کو یہاں تک کہ وہ لوگ بھول گئے یاددہانی کو۔''

مَتِّعْ ج:مَتِّعُوْا۔فعل امر ہے۔تو فائدہ اٹھانے دے۔تو برتنے کی چیز دے۔﴿ وَ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ ﴾(2/البقرہ:236)''اور برتنے کا سامان دو ان عورتوں کو وسعت والے پر ہے اس کی قدرت کے مطابق اور تنگدست پر ہے اس کی قدرت کے مطابق۔''

(تفعّل) **تَمَتُّعًا** کوشش کر کے کسی چیز سے فائدہ اٹھانا۔﴿ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ ﴾(47/محمد:12)''اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے ہیں جیسے کھاتے ہیں چوپائے۔''(حج کے ایک ہی سفر میں پہلے عمرے کا احرام باندھ کر عمرہ کر لیا جائے پھر مکہ مکرمہ سے ہی حج کا احرام باندھ کر حج کیا جائے تو اسے (ڈبل فائدہ اٹھانے کی وجہ سے)''حج تمتّع'' کہتے ہیں)۔

تَمَتَّعْ ج:تَمَتَّعُوْا۔فعل امر ہے۔تو فائدہ اٹھا۔﴿ فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ﴾(11/ھود:65)''تو انہوںؑ نے کہا تم لوگ فائدا اٹھا لو اپنے گھر میں تین دن۔''قرآن مجید میں جہاں کہیں تَمَتَّعْ اور تَمَتَّعُوْا (فعل امر) کے صیغے آئے ہیں تو اس سے دنیا سے فائدہ اٹھانے کو کہا گیا ہے اور بطور ڈانٹ کے کہا گیا ہے۔یعنی تمہیں ڈھیل دی جا رہی ہے برت لو جو برتنا ہے۔(لغات القرآن۔تلخیصاً)

(استفعال) **اِسْتِمْتَاعًا** کسی چیز سے فائدہ اٹھانا۔''کسی شخص یا مال سے کوئی فائدہ حاصل کیا جائے تو اس کو استمتاع کہتے ہیں عربی قواعد کی

رو سے کسی کلمہ کے مادے میں 'س' اور 'ت' کا اضافہ کر دینے سے طلب وحصول کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔'' (معارف القرآن، ج۲،ص:۳۶۶) ﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾ (46/الاحقاف:20) ''تم لوگ لے گئے اپنی پاکیزہ چیزیں اپنی دنیاوی زندگی میں اور تم لوگوں نے فائدہ اٹھایا اس سے۔''

ح ی ن

(ض) حَيْنًا کسی چیز کا وقت قریب آنا۔

حِيْنٌ ظرف زمان ہے۔ وقت۔ حِيْنٌ کہتے ہیں طویل اور لامحدود زمانے کا ایک محدود حصہ یعنی وہ خاص وقت جو اس طویل زمانے کے اندر کبھی پیش آیا ہو۔ اس طویل اور لامحدود زمانے کو قرآن میں الدّھر کہا گیا ہے۔ حِيْنٌ ظرف مبہم ہے یعنی اس میں غیر معین وقت کا مفہوم ہے۔ اگر کسی معین وقت کا ذکر ہو تو اس کے بعد مضاف الیہ یا کوئی فعل لاتے ہیں۔ ﴿وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝۹۸﴾ (10/یونس:98) ''اور ہم نے برتنے دیا ان کو ایک وقت تک یعنی کچھ عرصہ تک۔'' (غیر معین) ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ﴾ (2/البقرہ:177) ''اور ڈٹے رہنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت۔'' (معین وقت) ﴿وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ (25/الفرقان:42) ''اور وہ لوگ جلد ہی جان لیں گے جس وقت وہ لوگ دیکھیں گے عذاب کو۔'' (معین وقت)۔

حِيْنَئِذٍ۔ حِيْنٌ کے بعد اِذْ کا اضافہ کر کے حِيْنَئِذٍ بنا دیا جاتا ہے۔ اور یہ کسی معین وقت کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے۔ بمعنی ''اس وقت۔'' ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝۸۴﴾ (56/الواقعۃ:84) ''اور تم اس وقت (مرنے والے کی حالت کو) دیکھ رہے ہوتے ہو۔''

ترکیب اَزَلَّ فعل۔ هُمَا اس کا مفعول اور اَلشَّيْطٰنُ اس کا فاعل ہے۔ هُمَا کی ضمیر مفعولی، حضرت آدمؑ اور بی بی حوّا کے لیے ہے۔ عَنْهَا متعلق فعل ہے۔ عَنْ یہاں پر سببیہ ہے اور 'ھا' ضمیر گزشتہ آیت میں لفظ اَلشَّجَرَةَ کے لیے ہے۔ مطلب ہے ''اس درخت کے باعث'' یا ''اس درخت کی وجہ سے'' شیطان نے حضرت آدمؑ اور حوّا کو پھسلا دیا۔ آگے اَخْرَجَ کا فاعل اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے جو اَلشَّيْطٰنُ کے لیے ہے اور هُمَا اس کا مفعول ہے۔ مِمَّا۔ مِنْ اور مَا کا مرکب ہے۔ كَانَا بھی تثنیہ کا صیغہ ہے اور مراد حضرت آدمؑ اور حوّا ہیں۔ فِيْهِ متعلق فعل ہے۔ فِيْهِ میں 'ہ' ضمیر، اَلْجَنَّةَ کے لیے نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے مؤنث ضمیر 'ھا' آتی۔ چنانچہ اس سے 'عزت وراحت'' مراد لی گئی ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ ترجمہ کرتے ہیں ''پھر نکالا ان کو اس عزت وراحت سے کہ جس میں تھے۔'' قُلْنَا ماضی کا صیغہ ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحْنُ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اِهْبِطُوْا فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر اَنْتُمْ ہے جو کہ حضرت آدمؑ، بی بی حوّا اور شیطان کے لیے ہے۔ گویا اِهْبِطُوْا کے حکم میں یہ سب شامل تھے۔ اگلہ جملہ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ، اِهْبِطُوْا کی ضمیر فاعلی کا حال ہے یعنی ''تم سارے اتر جاؤ اس حال میں کہ تم میں سے بعض، بعض کے دشمن ہیں۔'' بَعْضُكُمْ مبتدا ہے، عَدُوٌّ خبر اور لِبَعْضٍ متعلق خبر ہے۔ آگے مُسْتَقَرٌّ اور مَتَاعٌ مبتدا موخر ہیں۔ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ قائم مقام خبر مقدم اور اِلٰى حِيْنٍ متعلق خبر ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ	فَاَزَلَّهُمَا	الشَّيْطٰنُ	عَنْهَا	فَاَخْرَجَهُمَا
البقرۃ:36	پھر پھسلا دیا ان دونوں کو	شیطان نے	اس (درخت کی وجہ) سے	پھر اس نے نکالا ان دونوں کو

مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠	وَقُلْنَا	اهْبِطُوْا	بَعْضُكُمْ
اس میں سے جس (عزت وراحت) میں وہ دونوں تھے	اور ہم نے کہا	تم لوگ اترو	(اس حال میں کہ) تم میں سے بعض

لِبَعْضٍ	عَدُوٌّ ۚ	وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ	مُسْتَقَرٌّ
بعض کے	دشمن ہیں	اور تمہارے لیے زمین میں ہے	ایک ٹھہرنے کی جگہ

وَّ مَتَاعٌ	اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾
اور فائدہ اٹھانے کا کچھ سامان	ایک عرصہ کے لیے

نوٹ:1 ایک اہم بات یہ نوٹ کرلیں کہ فَاَزَلَّهُمَا میں ضمیر مفعولی هُمَا تثنیہ کے صیغے میں آئی ہے۔اس سے وضاحت ہوجاتی ہے کہ لغزش میں حضرت آدمؑ اور بی بی حوّا، دونوں شامل تھے۔اس لیے یہ عام خیال غلط ہے کہ بی بی حوّا نے حضرت آدمؑ کو جنت سے نکلوایا تھا۔اس کی مزید تصدیق آگے فَاَخْرَجَهُمَا کے الفاظ سے ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو جنت سے نکلوانے کا ذمہ دار شیطان کو قرار دیا ہے۔اس کی ذمہ داری اگر بی بی حوّا ہوتیں تو اَخْرَجَ کے بجائے اَخْرَجَتْ کا صیغہ آتا اور ضمیر مفعولی واحد مذکر آتی۔(اَخْرَجَتْهُ)۔شیطان نے اُس درخت کی وجہ سے حضرت آدمؑ اور حضرت بی بی حوّا کو کیسے بہکایا اس کی تفصیل سورۂ طٰہٰ آیت 120 میں ہے۔

نوٹ:2 انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں البتہ ان سے نسیان (بھول)، اجتہادی غلطی وغیرہ کا صُدور ہوسکتا ہے جو کہ عصمت کے خلاف نہیں۔حضرت آدمؑ سے شجرہ ممنوعہ کھالینے میں نسیان ہی ہوا تھا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾﴾(طٰہٰ:115)''سو وہ بھول گئے اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) ان کا کوئی قصد۔''

آیت:37

﴿ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ ﴾

تَلَقّٰى (ل ق ی):البقرۃ آیت 14 دیکھیں۔ اٰدَمُ (ء د م):البقرۃ آیت 31 دیکھیں۔ رَبٌّ (ر ب ب):الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ك ل م

(ض۔ن) كَلْمًا زخم لگانا۔'ک ل م' ان مادوں میں سے ہے جن کا مفہوم ثلاثی مزید فیہ میں جا کر بالکل تبدیل ہوجاتا ہے۔

(تفعیل) تَكْلِيْمًا کسی سے بات چیت کرنا۔گفتگو کرنا۔﴿قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ﴾(3/آل عمران:41)''اس نے یعنی اللہ نے کہا آپؑ کی نشانی ہے کہ آپؑ بات نہیں کریں گے لوگوں سے تین دن۔''﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾﴾ (4/النساء:164)''اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔''

(تفعّل) تَكَلُّمًا بولنا۔کہنا۔﴿لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ﴾(78/النبا:38)''وہ لوگ نہیں بولیں گے مگر وہ جس کو اجازت دی اللہ نے۔''

كَلِمَةٌ ج: كَلِمَاتٌ اور كَلِمٌ۔اسم ذات ہے۔كَلِمَةٌ کا لغوی معنیٰ ''بامعنی بات'' ہے جس کا ادراک سماعت سے ہوسکے اور اس کا مفہوم بھی سمجھ میں آسکے۔اس کا اطلاق منظم و مرتب الفاظ اور اِن کے معانی دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے جیسے كَلِمَةُ التَّوْحِيْدِ (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ)، كَلِمَةُ التَّقْوٰى (بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ) اور بامعنی کلام کے ہر جز پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے خواہ وہ اسم ہو، فعل ہو یا حرف ہو۔چنانچہ عربی زبان میں کسی بات، خطبہ، شعر اور پورے

قصیدے کے لیے اس کا استعمال جائز ہے اور قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کو بھی کَلِمَةُ اللّٰه کہا گیا ہے کیونکہ وہ کلمہ کُنْ سے پیدا ہوئے تھے۔ کلمہ کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنیٰ عجائباتِ قدرت، قوانین فطرت اور اللہ تعالیٰ کے تخلیقی کارنامے مراد ہوتے ہیں۔ (تفہیم القرآن) چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴾ (18/الکہف:109) ''کہہ دو اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لکھنے کے لیے سیاہی ہو تو قبل اس کے کہ میرے رب کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے اگرچہ ہم ویسا ہی اور اُس کی مدد کو لائیں۔'' جب کلمہ کی نسبت اللہ تعالیٰ سے انسان کی طرف ہو تو اس سے مراد احکام الٰہیہ اور فرامین الٰہیہ ہوتے ہیں۔ ﴿ اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴾ (39/الزمر:19) ''بھلا جس شخص پر عذاب کی بات ثابت ہو چکی ہے تو کیا آپؐ اُسے جو دوزخ میں ہے چھڑا سکتے ہیں۔'' ﴿ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ ﴾ (23/المومنون:100) ''یہ تو بس ایک بات ہے، وہ اس کا کہنے والا ہے۔'' ﴿ وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ (10/یونس:82) ''اور سچ کرتا ہے اللہ حق کو اپنے فرمانوں سے اگرچہ ناپسند کریں مجرم لوگ۔'' ﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ﴾ (5/المائدہ:13) ''وہ لوگ پھیرتے ہیں الفاظ کو ان کے اصل مقام سے۔''

كَلَامٌ اسم ذات ہے۔ منظم، مرتب اور مکمل بات۔ کلام۔ بعض بزرگوں کا قول ہے کہ کلام ہر ایسی مفید بات کو کہتے ہیں جو مخاطب کی سمجھ میں آنے والی ہو۔ اور بعض بزرگوں کا قول ہے کہ کلام ایسی صفت ہے جس سے کوئی زندہ اپنے مافی الضمیر (جو کچھ اُس کے دل میں ہے) کو زبانی الفاظ، تحریر یا اشارات کے ذریعے دوسرے کو سمجھا سکے۔ ﴿ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ ﴾ (48/الفتح:15) ''وہ لوگ چاہتے ہیں کہ تبدیل کر دیں اللہ کے کلام کو۔''

ت و ب

(ن) تَوْبًا، تَوْبَةً اور مَتَابًا رجوع کرنا۔ پلٹنا۔ واپس ہونا۔ (۱) گناہ کے بعد بندے کا اپنی غلطی پر شرمندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف پلٹنا۔ توبہ کرنا۔ (۲) اللہ کا پلٹنا بندے پر اپنی شفقت اور رحمت کے ساتھ۔ توبہ قبول کرنا۔ توبہ کرنے کے مفہوم میں فعل کے ساتھ کبھی اِلیٰ کا صلہ آتا ہے اور کبھی صلہ کے بغیر آتا ہے۔ اس وقت دراصل اِلَی اللّٰهِ کے الفاظ محذوف ہوتے ہیں۔ جبکہ توبہ قبول کرنے کے مفہوم میں فعل کے ساتھ عَلٰی کا صلہ آتا ہے۔ ﴿ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ ﴾ (5/المآئدہ:74) ''تو وہ لوگ کیوں نہیں پلٹتے اللہ کی طرف یعنی کیوں توبہ نہیں کرتے اور مغفرت طلب کرتے اس سے۔'' ﴿ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ ﴾ (6/الانعام:54) ''بیشک وہ جس نے عمل کیا تم میں سے کسی برائی کا پھر وہ پلٹا یعنی اس نے توبہ کی اس کے بعد۔'' ﴿ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ ﴾ (33/الاحزاب:24) ''تاکہ اللہ جزا دے سچوں کو ان کی سچائی کے سبب سے اور تاکہ وہ عذاب دے منافقوں کو اگر وہ چاہے، یا وہ ان کی توبہ قبول کرے۔'' ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ ﴾ (66/التحریم:8) ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے سامنے سچی خالص توبہ کرو۔'' ﴿ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴾ (25/الفرقان:71) ''اور جس نے توبہ کی اور نیک کام کیے تو اُس نے رجوع کیا اللہ تعالیٰ کی طرف جیسے رجوع کا حق ہے۔''

تُبْ ج: تُوْبُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو توبہ کر یا توبہ قبول کر۔ ﴿ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ ﴾ (2/البقرہ:128) ''اور تو سمجھا دے ہم کو ہمارے عبادت کے طریقے اور تو ہماری توبہ قبول فرما۔'' ﴿ وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ﴾

(11 /ھود:52)''اور اے میری قوم تم لوگ مغفرت طلب کرو اپنے رب کی پھر تم لوگ توبہ کرو۔''

تَآئِبٌ ج: تَآئِبُوْنَ ۔اسم الفاعل ہے۔واحد مذکر کا صیغہ۔توبہ کرنے والا یا توبہ قبول کرنے والا۔﴿ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ ﴾(9 /التوبۃ:112)''توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے۔'' قرآن مجید میں تائب کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال نہیں ہوا۔

تَآئِبَۃٌ ج: تَآئِبَاتٌ۔اسم الفاعل ہے۔واحد مؤنث کا صیغہ۔توبہ کرنے والی۔﴿ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ ﴾ (66 /التحریم:5)''جو اسلام والیاں، ایمان والیاں، اللہ کے حضور جھکنے والیاں، توبہ کرنے والیاں۔''

تَوَّابٌ ج: تَوَّابُوْنَ ۔فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔بہت زیادہ اور بار بار توبہ کرنے والا یا توبہ قبول کرنے والا۔﴿ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾(9 /التوبۃ:104)''اور یہ کہ اللہ ہی بار بار توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔''﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ ﴾(2 /البقرہ:222)''یقیناً اللہ پسند کرتا ہے بار بار توبہ کرنے والوں کو۔'' تَوَّابٌ کا لفظ اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''لفظ تَوَّابٌ بندہ کے لیے بھی بولا جاتا ہے جیسے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ ﴾(2 /البقرۃ:222)''اور اللہ تعالیٰ کے لیے بھی جیسے اس آیت میں ﴿ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾(2 /البقرۃ:37)'' جب بندے کے لیے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں گناہ سے اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا، اور جب اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں توبہ قبول کرنے والا، یہ صرف لفظ تَوَّابٌ کا حکم ہے اسی معنی کا دوسرا لفظ تَآئِبٌ ہے، اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے جائز نہیں، اگرچہ لغوی معنی کے اعتبار سے وہ بھی غلط نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں صرف وہی صفات اور القاب استعمال کرنا جائز ہیں جن کا ذکر قرآن وسنت میں وارد ہے، باقی دوسرے الفاظ اگرچہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہوں مگر اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا استعمال درست نہیں۔''(معارف القرآن، ج ا ص ۲۰۱)۔

تَوْبَۃٌ اور تَوْبٌ اسم ذات ہیں۔توبہ۔﴿ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ ﴾(9 /التوبۃ:104)''کیا وہ لوگ جانتے نہیں کہ اللہ ہی قبول کرتا ہے توبہ کو اپنے بندوں سے۔''﴿ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ﴾ (40 /المومن:3)''گناہ کا بخشنے والا اور توبہ کا قبول کرنے والا ہے سخت سزا دینے والا ہے۔''

توبہ جب بندے کی طرف سے ہو تو وہ چار چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔(ا) اپنے کیے ہوئے گناہ کو گناہ سمجھنا اور اُس پر ندامت ہونا۔(ب) اس گناہ کو بالکل چھوڑ دینا۔(ج) آئندہ کے لیے دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرنا۔یعنی گزشتہ پر ندامت اور اعتراف جرم، حال میں اُس کا ترک کرنا اور مستقبل میں نہ کرنے کا ارادہ کرنا اور چوتھی شرط یہ ہے کہ (د) اگر معاملہ حقوق العباد کا ہو تو جس کا حق مارا ہو اس کا حق واپس کرنا یا اس سے معافی مانگنا اور اگر معاملہ حقوق اللہ کا ہے تو جو فرائض فوت ہو چکے ہوں اور اگر ان کی قضا ہے، تو قضا ادا کرنا۔یہ چار چیزیں کسی توبہ میں ہوں، تب وہ حقیقتاً توبہ ہے۔

اَلرَّحِيْمُ (ر ح م): آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ترکیب فَتَلَقّٰٓى فعل ماضی، اٰدَمُ فاعل، مِنْ رَّبِّهٖ متعلق فعل اور كَلِمٰتٍ مفعول ہے۔تَابَ کے ساتھ عَلٰی کا صلہ آیا ہے چنانچہ اس کا مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ حضرت آدمؑ پر متوجہ ہوا یا دوسرے الفاظ میں ان کی توبہ قبول کی۔عَلَيْهِ میں 'ہ' ضمیر حضرت آدمؑ کے لیے اور تَابَ کی ضمیر فاعلی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔اِنَّ کا اسم منصوب ہوتا ہے، اس لیے اِنَّهٗ میں اِنَّ کے بعد ضمیر مرفوعہ هُوَ کے بجائے ضمیر منصوبہ ہٗ آئی ہے۔هُوَ ضمیر فاصل ہے، کیونکہ تَوَّابٌ اور رَحِيْمٌ، خبریں معرّف باللّام ہیں اور اس سے حصر کا مفہوم بھی پیدا ہوا ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:37

فَتَلَقّٰٓی	اٰدَمُ	مِنۡ رَّبِّہٖ	کَلِمٰتٍ	فَتَابَ عَلَیۡہِ ؕ
تو سیکھ لیے	حضرت آدمؑ نے	اپنے رب سے	کچھ الفاظ	تو اس (اللہ تعالیٰ) نے توبہ قبول کی ان (آدمؑ) کی

اِنَّہٗ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۳۷﴾
یقیناً وہ ہی بار بار توبہ قبول کرنے والا بہت رحم کرنے والا ہے

نوٹ: 1 دیکھیے یہاں تَلَقّٰی کی جگہ عَلَّمَ کا لفظ بھی آ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ان کلمات کا علم سکھا دیا اور تَعَلَّمَ بھی آ سکتا تھا کہ حضرت آدمؑ نے خود کوشش کر کے کلمات سیکھ لیے۔ لیکن یہاں تَلَقّٰی آیا ہے جو فصاحت اور بلاغت کی انتہا ہے اور اس ایک لفظ نے حضرت آدمؑ کی کیفیت کو واضح کر دیا ہے۔ یعنی وہ جنت سے نکالے جانے کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے کی وجہ سے بہت بے قرار تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کو کلمات سکھائے تو انہوں نے اِن کا بھرپور طریقے سے استقبال کیا۔ مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''تَلَقّٰی کے معنی ہیں شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا اور اس کو قبول کرنا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اُن کو توبہ کے کلمات کی تلقین کی گئی تو آدمؑ نے اہتمام کے ساتھ اُن کو قبول کیا۔'' (معارف القرآن، ج۱، ص۱۹۹)۔ یہ کلمات سورۃ الاعراف کی آیت نمبر 23 میں بیان ہوئے ہیں۔ ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ۫ وَ اِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَ تَرۡحَمۡنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۲۳﴾﴾۔ اس آیت مبارکہ سے عیسائیوں کے عقیدے (Original Sin) کی بھی نفی ہو گئی ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ان کلمات کو اپنی دعا میں اپناؤ جن کے ذریعے تمہارے باپ آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی۔ (واللہ اعلم)۔

آیت: 38

﴿قُلۡنَا اہۡبِطُوۡا مِنۡہَا جَمِیۡعًا ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ہُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾﴾

قُلۡنَا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ اِہۡبِطُوۡا (ھ ب ط): البقرۃ آیت 36 دیکھیں۔ جَمِیۡعًا (ج م ع): البقرۃ آیت 29 دیکھیں۔

اِمَّا اِمَّا ''حروف غیر عاملہ'' میں سے ہے اس کے معنی ہوتے ہیں ''یا'' اور یہ جملے میں دو بار استعمال ہوتا ہے اور کئی معنی دیتا ہے۔

(1) بطور حرف تفصیل: جیسے فرمایا: ﴿اِنَّا ہَدَیۡنٰہُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا ﴿۳﴾﴾ (76/الدھر:3) ''ہم ہی نے اس کو راستہ بتایا (پھر) یا تو وہ شکر گزار ہوا اور یا کافر ہو گیا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''ہم نے اس کو سجھائی راہ یا حق مانتا ہے اور یا ناشکری کرتا ہے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(2) شک و ابہام کے موقع پر جیسے: جَاءَ اِمَّا زَیۡدٌ وَاِمَّا خَالِدٌ۔ یا تو زید آیا ہے یا خالد گویا یہ معلوم نہیں کہ دونوں میں سے کون آیا ہے۔

(3) اِبَاحَتْ (جائز قرار دینا) اور تخییر (اختیار دینا) کے معنی بھی دیتا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنۡ نَّکُوۡنَ نَحۡنُ الۡمُلۡقِیۡنَ ﴿۱۱۵﴾﴾ (7/الاعراف:115) ''وہ (جادوگر) بولے اے موسیٰؑ یا تو آپؑ پہلے ڈالیے یا ہم ہی پہلے ڈالنے والے ہوں۔'' یہاں اس آیت مبارکہ میں اِمَّا تخییر کے معنی دے رہا ہے۔

نوٹ: کبھی اِمَّا، اِنْ شرطیہ اور 'مَا' زائدہ کا مرکب ہوتا ہے اور 'مَا' زائدہ تاکید کے معنی دیتا ہے۔ اِنْ شرطیہ کے ساتھ مضارع مجزوم آتا ہے لیکن اِمَّا کے ساتھ مضارع، نون ثقیلہ کے ساتھ آتا ہے جیسے آیت زیر مطالعہ میں ہے یا فرمایا: ﴿فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الۡبَشَرِ اَحَدًا ۙ﴾ (9/مریم:26) ''پھر اگر تو دیکھے کوئی آدمی۔'' ﴿وَ اِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡہُمُ﴾ (17/بنی اسرائیل:28) ''اور اگر آپؐ کو اُن سے منہ پھیرنا ہی پڑے۔'' وغیرہ۔

یَاۡتِیَنَّ (ء ت ی): البقرۃ آیت 23 دیکھیں۔ ہُدًی (ھ د ی): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔ مَنۡ: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

ت ب ع

(س) تَبَعًا کسی کے نقشِ قدم پر چلنا۔ کسی کی پیروی کرنا۔ ﴿فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾ (14/ابراہیم:36) ''پس جس نے میری پیروی کی تو یقیناً وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو بیشک تو بہت ہی بخشنے والا ہر حال میں رحم کرنے والا ہے۔''

تَابِعٌ ج: تَابِعُوْنَ اور تَبَعٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ پیروی کرنے والا۔ خدمت کرنے والا۔ نوکر۔ ﴿وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ﴾ (2/البقرۃ:145) ''اور آپؐ پیروی کرنے والے نہیں ہیں ان کے قبلہ کی۔'' ﴿اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا﴾ (40/المومن:47) ''بیشک ہم تو تمہاری پیروی کرنے والے تھے۔'' ﴿اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ﴾ (24/النور:31) ''یا اپنے ایسے نوکروں پر جو (عورت) کے خواہش مند نہ ہوں مردوں میں سے۔'' (نوٹ: تَبَعٌ مصدر بھی ہے مطلب ہے پیروی کرنا اور تَابِعٌ کی جمع بھی ہے مطلب ہے پیروی کرنے والے)۔

تَبِیْعٌ فَعِیْلٌ کے وزن پر بمعنی اسم الفاعل ہے۔ اس لفظ کے لفظی معنی ہیں ''پیچھا کرنے والا'' البتہ ہمارے بزرگوں نے اس لفظ کے کئی طرح سے ترجمے کیے ہیں، مثلاً: باز پرس کرنے والا۔ دعویٰ کرنے والا۔ انتقام لینے والا، وغیرہ۔ قرآن مجید میں یہ ایک ہی مرتبہ، سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 69 میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا ۝﴾ ''اور تم کو اس بات پر ہمارا کوئی پیچھا کرنے والا نہ ملے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ''پھر نہ پاؤ اپنی طرف سے ہم پر اُس کا کوئی باز پرس کرنے والا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''پھر تم اپنے لیے ہم پر اُس کا دعویٰ (پیچھا) کرنے والا کسی کو نہ پاؤ گے۔'' (ترجمہ احسن البیان) ''پھر تم نہیں پاؤ گے اپنے لیے ہم سے اس ڈبونے پر کوئی انتقام لینے والا۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

تُبَّعٌ یمن کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ ﴿اَهُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ﴾ (44/الدخان:37) ''کیا یہ لوگ بہتر ہیں یا یمن کے بادشاہوں کی قوم۔''

(افعال) اِتْبَاعًا (۱) کسی کے پیچھے لگنا۔ (۲) کسی کو کسی کے پیچھے لگانا، اس صورت میں اس کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ ﴿فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۝﴾ (7/الاعراف:175) ''پس پیچھے لگا اس کے شیطان تو وہ ہو گیا گمراہوں میں سے۔'' ﴿وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً ۚ﴾ (28/القصص:42) ''تو ہم نے ان کے پیچھے لگا دیا اس دنیا میں لعنت کو۔''

(افتعال) اِتِّبَاعًا اہتمام سے پیروی کرنا۔ پیچھا کرنا۔ ﴿رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ﴾ (3/آل عمران:53) ''اے ہمارے رب ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل کیا اور ہم نے پیروی کی اِن رسولؑ کی۔'' پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''کسی کے فعل کے اتباع کا یہ معنی ہے کہ اس کے اس فعل کو اس طرح کیا جائے جس طرح وہ کرتا ہے اور اس لیے کیا جائے کیونکہ وہ کرتا ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ۱، ص: ۲۲۳)

اِتَّبِعْ ج: اِتَّبِعُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو پیروی کر۔ ﴿وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ﴾ (31/لقمان:15) ''اور تو پیروی کر اس کے راستے کی جس نے رخ کیا میری طرف۔'' ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (2/البقرۃ:170) ''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم لوگ پیروی کرو اُس کی جس کو نازل کیا اللہ نے۔''

مُتَّبَعٌ ج: مُتَّبَعُوْنَ۔ اسم المفعول ہے۔ جس کی پیروی کی جائے۔ جس کا پیچھا کیا جائے۔ ﴿فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝﴾ (44/الدخان:23) ''تو تم روانہ ہو میرے بندوں کے ساتھ رات کے وقت یقیناً تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔''

(تفاعل) تَتَابُعًا ایک کے پیچھے ایک آنا۔لگا تار آنا۔

مُتَتَابِعٌ ج: مُتَتَابِعُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ ایک کے پیچھے ایک آنے والا۔لگا تار آنے والا۔ ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ﴾ (4/النساء:92) ''پس جو نہ پائے تو روزہ (رکھنا) ہے ایک کے پیچھے ایک آنے والے یعنی مسلسل دو مہینوں کا۔''

خ و ف

(ف) خَوْفًا اور خِيْفَةً آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف و مصیبت کا اندیشہ کرنا۔ڈرنا۔خوف محسوس کرنا۔اس کا تعلق مستقبل سے ہے۔ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ﴾ (11/ھود:103) ''بیشک اس میں نشانی ہے اس کے لیے جو ڈرے آخرت کے عذاب سے۔'' ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً﴾ (7/الاعراف:205) ''اور یاد کر اپنے رب کو اپنے جی میں گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے۔'' خِيْفَةً، اصل میں خَوْفَةٌ تھا۔'و' ، 'ی' میں تبدیل ہوگئی اور خ کی زبر کو 'ی' کی مناسبت سے زیر میں تبدیل کر دیا۔اس طرح خِيْفَةٌ بن گیا۔ اَلْخَوْفُ مِنَ اللّٰهِ: امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ جس طرح انسان شیر کے دیکھنے سے ڈر محسوس کرتا ہے، اسی قسم کا رعب اللہ تعالیٰ کے تصور سے انسان کے قلب پر طاری ہو جائے بلکہ خوف الٰہی کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہوں سے بچتا رہے اور طاعات کو اختیار کرے۔اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ جو شخص گناہ ترک نہیں کرتا وہ خائف یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا نہیں ہو سکتا۔'' (مفردات القرآن، ج ۱، ص ۳۲۳)

خَوْفٌ اسم ذات بھی ہے۔ڈر۔خوف۔ ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ﴾ (2/البقرہ:155) ''اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو تھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔'' خوف اور خشیّت میں فرق: مولانا مودودیؒ ان دو لفظوں میں فرق واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عربی زبان میں ڈر کے لیے خوف اور خشیّت دو لفظ استعمال ہوتے ہیں جن کے مفہوم میں ایک باریک فرق ہے۔خوف کا لفظ بالعموم اُس ڈر کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی کی طاقت کے مقابلہ میں اپنی کمزوری کے احساس کی بنا پر آدمی کے دل میں پیدا ہو۔اور خشیت اُس ہیبت کے لیے بولتے ہیں جو کسی کی عظمت کے تصور سے آدمی کے دل میں طاری ہو۔'' (تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۱۲۳)

خَائِفٌ ج: خَائِفُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔ڈرنے والا۔ ﴿فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ﴾ (28/القصص:21) ''پس وہ نکلے اس (بستی) سے ڈرنے والا ہوتے ہوئے، (اپنی گرفتاری) کا انتظار کرتے ہوئے۔''

خَفْ ج: خَافُوْا۔فعل امر ہے۔تو ڈر۔ ﴿فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (3/آل عمران:175) ''پس تم اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھ ہی سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔''

(تفعیل) تَخْوِيْفًا خوف دلانا۔ڈرانا۔ ﴿ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ﴾ (39/الزمر:16) ''یہ ہے، خوف دلاتا ہے اللہ اس سے اپنے بندوں کو۔'' ''اللہ تعالیٰ کا لوگوں کو ڈرانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو برے کاموں سے بچنے کی ترغیب دیتا ہے۔'' (راغبؒ)۔ ﴿وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا﴾ (17/بنی اسرائیل:59) ''اور ہم نہیں بھیجتے ایسی نشانیاں مگر (لوگوں کو عذاب سے) خوف زدہ کرنے کے لیے۔''

(تفعّل) تَخَوُّفًا انسان میں خوف ظاہر ہونا۔ڈرنا۔خوف محسوس کرنا۔جب اس کے ساتھ عَلٰی کا صلہ استعمال ہو تو پھر اس سے دو معنی مراد لیے جاتے ہیں (1) کسی کو ڈرانا یا خوف دلانا۔(2) تَنَقُّصٌ یعنی کسی چیز کو آہستہ آہستہ کم کرنا۔قرآن مجید میں تَخَوُّفًا

ایک ہی مرتبہ استعمال ہوا ہے سورۂ نحل کی آیت 47 میں: ﴿ اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ ؕ ﴾ اس آیت کا ترجمہ اِن دونوں مفہوم کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ ''یا پکڑے اُن کو ڈرانے کے بعد'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''یا اُنہیں گھٹاتے گھٹاتے پکڑ لے'' (ترجمہ ماجدیؒ)

ح ز ن

(س) حَزَنًا غمگین ہونا۔ پچھتانا۔ (لازم) ﴿ تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا ﴾ (41/حٰمٓ السجدہ:30) ''اترتے ہیں ان پر فرشتے کہ خوف مت کرو اور غمگین مت ہو۔''

(ن) حَزْنًا غمگین کرنا۔ (متعدی) ﴿ وَلَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ ۚ ﴾ (3/آل عمران:176) ''اور غمگین نہ کریں آپؐ کو وہ لوگ جو باہم سبقت کرتے ہیں کفر میں۔''

حُزْنٌ اور حَزَنٌ دونوں اسم ذات ہیں۔ غم۔ افسوس۔ کسی مقصد و مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو یا کسی پیاری چیز سے محروم ہو جانے پر دل میں جو دکھ پیدا ہوتا ہے اُسے حزن کہتے ہیں۔ اس کا تعلق ماضی سے ہے۔ ﴿ وَابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ ﴾ (12/یوسف:84) ''اور سفید ہو گئیں انؑ کی آنکھیں غم سے۔'' ﴿ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ ﴾ (35/فاطر:34) ''اور ان لوگوں نے کہا تمام حمد اللہ کے لیے ہے جو لے گیا ہم سے غم کو۔''

ترکیب

قُلْنَا فعل ماضی ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحْنُ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور اگلا جملہ وہ بات ہے جو کہی گئی ہے۔ اِهْبِطُوْا فعل امر ہے۔ اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر اس کا فاعل ہے۔ مِنْهَا متعلق فعل ہے اور هَا ' ضمیر اَلْجَنَّة کے لیے ہے اور جَمِیْعًا لفظاً تو اِهْبِطُوْا کی ضمیر فاعلی کا حال ہے اور معناً تاکید ہے یعنی تم سب اترو۔ فَاِمَّا میں 'فَ' حرف عطف ہے اور اِمَّا، اِنْ شرطیہ اور 'مَا' زائدہ کا مرکب ہے۔ 'مَا' زائدہ تاکید کے لیے ہے۔ یَاْتِیَنَّ، اصل میں فعل مضارع یَاْتِیْ پر نون ثقلیہ داخل کرنے سے بنا ہے۔ اس کا مفعول کُمْ ضمیر ہے، مِنِّیْ متعلق فعل ہے اور هُدًی اس کا فاعل ہے اس لیے محلاً حالت رفع میں ہے۔ مِنِّیْ اصل میں حرف جر مِنْ اور یائے متکلم کا مرکب جاری ہے۔ یہ ان بعض صورتوں میں سے ہے جہاں ن وقایہ آتا ہے چنانچہ یہ مِنْ نِیْ ہے۔ جب اِن کو ملایا تو ن وقایہ کا مِنْ کے 'نْ' کے اندر ادغام ہوا اور مِنِّیْ بن گیا۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی، جملہ شرطیہ ہے اور اس کا جواب شرط اگلا پورا جملہ فَمَنْ تَبِعَ سے لے کر اخیر تک ہے جو کہ خود ایک جملہ شرطیہ ہے۔ چنانچہ فَمَنْ میں 'فَ' جواب شرط کے لیے ہے۔ مَنْ شرطیہ اور مبتدا ہے۔ مَنْ موصول، واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے یہاں مَنْ کی لفظی رعایت کے تحت واحد مذکر غائب کا صیغہ تَبِعَ آیا ہے۔ لیکن مَنْ یہاں جمع کے معنوں میں ہے اس لیے آگے عَلَیْهِمْ اور وَلَا هُمْ میں اس کی معنوی رعایت کرتے ہوئے جمع کی ضمیریں آئی ہیں۔ تَبِعَ فعل ماضی ہے اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل ہے هُدَایَ اس کا مفعول ہے جو کہ مرکب اضافی ہے۔ هُدَا دراصل اَلْهُدٰی تھا۔ مضاف ہونے کی وجہ سے لام تعریف گرا تو هُدٰی باقی بچا اور قاعدہ یہ ہے کہ الف مقصورہ (جس کے آخر میں ___ ی ہو) والے لفظ کے بعد اگر ضمیر آئے تو اسے الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ هُدٰی کی 'ی' گری اور هُدَا باقی بچا۔ اس کے آگے یَ دراصل یائے متکلم ہے جس سے پہلے اگر الف ہو تو اسے فتحہ سے پڑھتے ہیں۔ تَبِعَ هُدَایَ، جملہ فعلیہ بن کر مَنْ کی خبر ہے اور یہ جملہ اسمیہ، شرط ہے اور محلاً مجزوم ہے۔ آگے فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ، اس شرط کی جزا ہے۔ اس میں 'فَ' جواب شرط کے لیے ہے، لَا نفی کا ہے، خَوْفٌ مبتداء ہے اور عَلَیْهِمْ محذوف خبر سے متعلق ہے۔ 'وَ' عطف کا ہے لَا نافیہ ہے۔ هُمْ مبتدا اور جملہ فعلیہ یَحْزَنُوْنَ اس کی خبر۔ جملہ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ معطوف ہے جملہ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ پر۔ اور جملہ اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ اپنے جواب شرط کے ساتھ مل کر (جو کہ خود ایک جملہ شرطیہ ہے) معطوف ہے جملہ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا پر۔ حضرت مفتی محمد شفیعؒ آیت کے آخری حصے فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ کے متعلق فرماتے ہیں: ''خوف کی نفی تو عام انداز میں کر دی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ لَا حُزْنَ عَلَیْهِمْ،

بلکہ بصیغۂ فعل لایا گیا، اور اُس کی ضمیر فاعل کو مقدم کر کے وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات کی مکمل پیروی کرنے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا۔'' (معارف القرآن، ج ا، ص ۲۰۲)

ترجمہ
البقرة:38

قُلْنَا	اهْبِطُوْا	مِنْهَا	جَمِيْعًا ۚ	فَاِمَّا	يَاْتِيَنَّكُمْ
ہم نے کہا	تم لوگ اترو	اس (جنت) سے	سب کے سب	پھر اگر	آئے تمہارے پاس

مِّنِّيْ	هُدًى	فَمَنْ	تَبِعَ	هُدَاىَ	فَلَا خَوْفٌ
میری طرف سے	کوئی ہدایت	پس جس نے	پیروی کی	میری ہدایت کی	تو نہ کوئی خوف ہوگا

عَلَيْهِمْ	وَلَا	هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٨﴾
ان پر	اور نہ ہی وہ لوگ	غمگین ہوں گے

نوٹ: 1 ''نیچے اُترنے کا حکم دوبارہوا۔ پہلے لغزش کے صادر ہونے کے بعد، پھر قبول توبہ کے بعد، پہلے حکم سے ناراضگی کا اظہار مقصود تھا۔ اور دوسری بار منصب خلافت سنبھالنے کے لیے دونوں حکموں کی غرض و غایت الگ الگ ہے، اس لیے یہاں تکرار نہیں۔'' (ضیاء القرآن، ج ا، ص ۵۱)

نوٹ: 2 اس آیت مبارکہ کے مطالعے کے بعد اگر استاد محترم جناب عامر سہیل صاحب کی کتاب 'لسان القرآن' سے جملہ شرطیہ کے قواعد دوبارہ پڑھ لیے جائیں تو انشاء اللہ کافی فائدہ ہوگا۔

آیت: 39

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٩﴾ ع﴾

كَفَرُوْا (ك ف ر): البقرة آیت 6 دیکھیں۔ كَذَّبُوْا (ك ذ ب): البقرة آیت 10 دیکھیں۔
اٰيٰتٌ: نوٹس کے آغاز میں لفظ سورۃ کے بعد دیکھیں۔

ص ح ب

(س) صُحْبَةً کسی کے ساتھ رہنا۔ ساتھی ہونا۔

صَاحِبٌ ج: اَصْحَابٌ، صَحَابَةٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مذکر۔ والا۔ ساتھی۔ ساتھ رہنے والا لیکن ایسے ساتھی کو صاحب کہا جاتا ہے جس کی رفاقت بکثرت ہو۔ کسی شے کے مالک کو بھی صاحب کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسے صَاحِبُ الْبَيْتِ۔ گھر کا مالک۔ اور اسی طرح اُس کو بھی جو اس شے میں تصرف کا مالک ہو۔ ﴿اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ﴾ (9/التوبۃ:40) ''جب انہوںؐ نے کہا اپنے ساتھی سے آپؓ غمگین نہ ہوں۔'' ﴿وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ﴾ (68/القلم:48) ''اور آپؐ مت ہوں مچھلی والےؑ کی مانند۔'' ﴿لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ﴾ (6/الانعام:71) ''اس کے کچھ ساتھی ہیں، وہ لوگ بلاتے ہیں اس کو ہدایت کی طرف کہ تو آ ہمارے پاس۔'' ﴿وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ﴾ (7/الاعراف:44) ''اور پکارا جنت والوں نے آگ والوں کو۔'' صَحَابَةٌ، نبی اکرمؐ کے ساتھیوں کو کہتے ہیں جو حضورؐ پر

ایمان لائے، اُن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اُن کا خاتمہ بھی ایمان پر ہوا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

صَاحِبَةٌ ج: صَاحِبَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مونث۔ ساتھ رہنے والی۔ بیوی۔ چونکہ بیوی رفیقہ حیات ہوتی ہے اس لیے صاحبہ کہلاتی ہے۔ ﴿اَنّٰی یَکُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ﴾ (6/الانعام:101) ''اللہ تعالیٰ کی اولاد کہاں سے ہوسکتی ہے حالانکہ اُس کی کوئی بیوی تو ہے ہی نہیں۔''

(افعال) اِصْحَابًا کسی کو رفاقت دینا۔ کسی کی تائید وحمایت کرنا۔ ﴿لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَ لَا هُمْ مِّنَّا یُصْحَبُوْنَ﴾ (21/الانبیاء:43) ''وہ لوگ طاقت نہیں رکھتے اپنے آپ کی مدد پر اور نہ ہی وہ ہماری طرف سے رفاقت دیے جاتے ہیں۔'' ''وہ جھوٹے معبود تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور نہ اُنہیں ہماری تائید میسر ہوگی۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ یُصْحَبُوْنَ مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔

(مفاعلہ) مُصَاحَبَةً باہم ساتھ رہنا۔ مل کر رہنا۔ کسی کو ساتھ رکھنا۔

لَا تُصَاحِبْ فعل نہی ہے۔ تو ساتھ نہ رکھ۔ ﴿فَلَا تُصٰحِبْنِیْ﴾ (18/الکہف:76) ''تو آپ ساتھ نہ رکھیں مجھے۔''

صَاحِبْ فعل امر ہے۔ تو ساتھ رہ۔ ﴿وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا﴾ (31/لقمان:15) ''اور تو ساتھ رہ ان دونوں کے یعنی والدین کے دنیا میں اچھے طریقے سے۔''

اَلنَّارُ (ن و ر): البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔ خٰلِدُوْنَ (خ ل د): البقرۃ آیت 25 دیکھیں۔

ترکیب 'وٗ' عطف کا ہے اور اَلَّذِیْنَ اسم موصول ہے اور مبتدا ہے اور یہ گزشتہ آیت میں فَمَنْ کے مَنْ پر عطف ہے۔ کَفَرُوْا اس کا صلہ ہے۔ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ معطوف ہے کَفَرُوْا پر۔ بِاٰیٰتِنَآ کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''اہل جنت کے ذکر میں ذاتِ حق کے لیے ضمیر متکلم صیغہ واحد کی ابھی گزر چکی ہے، تَبِعَ هُدَایَ اور اہل جہنم کے سلسلہ میں وہی ضمیر متکلم صیغہ جمع میں ہوگئی ہے، بِاٰیٰتِنَآ۔ اہل لطائف نے لکھا ہے کہ وہ موقع اظہار خصوصیت و شفقت کا تھا۔ اس لیے ''میری'' ہی مناسب تھا۔ اب محل حاکمانہ جلالت واقتدار کا ہے، اس لیے یہاں ''ہماری'' ہی موزوں ہے۔'' آگے اُولٰٓئِكَ مبتدا ہے اور اَصْحٰبُ النَّارِ اس کی خبر۔ یہ جملہ اسمیہ خبر ہے اَلَّذِیْنَ کی۔ هُمْ پھر مبتدا ہے، فِیْهَا متعلق خبر ہے 'ھا' ضمیر اَلنَّارِ کے لیے ہے اور خٰلِدُوْنَ خبر ہے۔ یہ جملہ اسمیہ، حال ہے اَصْحٰبُ النَّارِ کا۔ (واللّٰہ اعلم)۔

ترجمہ
البقرۃ:39

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا	وَ كَذَّبُوْا	بِاٰیٰتِنَآ	اُولٰٓئِكَ	اَصْحٰبُ النَّارِ ج
اور جن لوگوں نے انکار کیا	اور جھٹلایا	ہماری نشانیوں کو	تو وہ لوگ	آگ والے ہیں

هُمْ	فِیْهَا	خٰلِدُوْنَ ع
وہ لوگ	اس (آگ) میں	ہمیشہ رہنے والے ہیں

نوٹ انکار اور تکذیب تقریباً ہم معنی ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے، میں نہیں مانتا تو یہ انکار ہے۔ دوسرا شخص کہتا ہے کہ یہ بات غلط ہے اور اس غلط بات کو میں جھٹلاتا ہوں تو یہ تکذیب ہے۔

آیت:40

﴿ يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ ﴾

اِبْنٌ بیٹا۔تثنیہ:اِبْنَانِ (رفع)اِبْنَيْنِ (نصب،جر)

ج:جمع سالم: بَنُوْنَ (رفع)بَنِيْنَ (نصب،جر)

جمع مکسر: اَبْنَاءُ (غیر منصرف)

مؤنث: بیٹی۔اِبْنَةٌ اور بِنْتٌ۔تثنیہ:اِبْنَتَانِ (رفع)اِبْنَتَيْنِ (نصب،جر)

ج:بَنَاتٌ

صاحبؒ تفسیر حقانی فرماتے ہیں:''اگرچہ اِبْنٌ کے معنی بیٹے کے ہیں مگر پوتے اور اس کی اولاد پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔اس لیے اِس وقت کے لوگوں کو بھی بنی آدم کہتے ہیں۔''(تفسیر حقانی،ج۱،ص:۴۴۰)

اِبْنٌ کا اعراب:

اِبْنٌ کا اعراب اس لفظ کے اعراب کے مطابق ہوتا ہے جس کے لیے اِبْنٌ کا لفظ آیا ہو۔جیسے قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ (المائدۃ:114)۔اس جملہ میں لفظ عیسیٰ فاعل ہونے کی وجہ سے رفع میں ہے اس لیے اِبْنُ (نون کی پیش کے ساتھ) آیا ہے۔بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ (المائدۃ:46)۔یہاں لفظ عیسیٰ حرفِ جار بِ کی وجہ سے حالتِ جر میں ہے اس لیے اِبْنِ (نون کی زیر کے ساتھ) آیا ہے۔وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ (البقرۃ:87) میں اٰتَيْنَا کا مفعول ہونے کی وجہ سے لفظ عیسیٰ حالتِ نصب میں ہے اس لیے اِبْنَ (نون کی زبر کے ساتھ) آیا ہے۔

اِبْنٌ کی تصغیر:

تَصْغِيْرٌ کا مطلب ہے چھوٹا پن۔کسی چیز میں چھوٹا پن بتانے کے لیے ثلاثی اسم کو فُعَيْلٌ یا فُعَيْلَةٌ کے وزن پر لے آتے ہیں جسے اَلْاِسْمُ التَّصْغِيْر یا اَلْاِسْمُ الْمُصَغَّر کہتے ہیں اور اصل لفظ کو مُكَبَّرٌ کہتے ہیں۔چنانچہ اِبْنٌ (دراصل بَنْوٌ) کا اسم تصغیر بُنَيْوٌ بنتا ہے۔'و' کو 'ی' میں تبدیل کر کے بُنَيْيٌ بنا اور پھر 'ی' کا ادغام ہو کر بُنَيٌّ بن گیا۔مطلب ہے چھوٹا سا بیٹا۔یا پیارا سا بیٹا۔﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ﴾ (31/لقمان:13) ''اے میرے پیارے بیٹے اللہ کے ساتھ شرک مت کرو۔''

اِبْنُ السَّبِيْلِ:

لفظی معنی ہے راستے کا بیٹا۔لیکن عربی زبان میں یہ مسافر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔عربی زبان میں اَبْنَاءُ السَّبِيْلِ استعمال ہی نہیں ہوتا۔مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''اِبْنٌ کا لفظ اصل میں تو بیٹے کے لیے بولا جاتا ہے لیکن عربی محاورات میں اِبْنٌ اور اَبٌ اور اَخٌ وغیرہ کے الفاظ ان چیزوں کے لیے بھی بولتے جاتے ہیں جن کا گہرا تعلق کسی سے ہو،اسی محاورہ کے مطابق ابن السبیل،راہ گیر و مسافر کو کہا جاتا ہے،کیونکہ ان کا گہرا تعلق راستہ قطع کرنے اور منزل مقصود پر پہنچنے سے ہے۔''(معارف القرآن،ج۴،ص۴۰۹)

اِسْرَآءِيْلُ اسرائیل،حضرت یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ کا لقب ہے۔بعض بزرگوں کے نزدیک یہ ان کا دوسرا نام ہے۔اسرائیل عبرانی زبان کا لفظ ہے۔یہ مرکب اضافی ہے اور غیر منصرف ہے۔''اِسْرَا'' کے معنیٰ بندہ کے ہیں اور ''اِيْل'' عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔لہٰذا اسرائیل

کے معنی ہوں گے عَبْدُاللّٰہِ یعنی اللہ کا بندہ۔ ان کے بارہ بیٹے تھے۔ اِن بیٹوں سے جو نسل چلی وہ بنی اسرائیل کہلائی۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''بنی اسرائیل'' تو ایک قومی و نسلی اصطلاح ہے۔ مذہبی حیثیت سے یہ لوگ یہود تھے۔ اہل کتاب تھے۔ توریت محرف و مسخ شدہ ہو کر، لیکن بہر حال موجود ان کے درمیان تھی۔ سلسلۂ وحی و نبوت اور عقیدۂ جزا و سزا کے کسی نہ کسی صورت میں قائل تھے۔ علوم انبیاء و معارفِ اولیاء کے حامل تھے۔ مالدار تھے، ساہوکار تھے۔ ساتھ ہی سفلی عملیات، سحر و کہانت نیز تجارت کے بھی بڑے ماہر تھے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۲۳)۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرماتے ہیں: ''قرآن مجید کے نزول کے وقت تک ان پر عروج و زوال کے چار ادوار آ چکے تھے۔ دو مرتبہ ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بارشیں ہوئیں اور انہیں عروج نصیب ہوا، جبکہ دو مرتبہ دنیا پرستی، شہوت پرستی اور اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دینے کی سزا میں ان پر اللہ کے عذاب کے کوڑے برسے۔ اس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں آئے گا۔ اُس وقت جبکہ قرآن نازل ہو رہا تھا وہ اپنے اس زوال کے دور میں تھے۔'' (بیان القرآن، ج ۱، ص: ۲۴۹)۔

ذ	ك	ر

(ن) ذِكْرًا یاد کرنا۔ یاد رکھنا۔ کسی کا ذکر کرنا۔ نصیحت حاصل کرنا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''ذکر کے اصل معنی یاد کرنے کے ہیں، جس کا تعلق قلب سے ہے، زبان سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لیے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمان قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو۔'' (معارف القرآن، ج ۱، ص: ۳۹۲) ﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ (3/آل عمران:191) ''وہ لوگ جو یاد رکھتے ہیں اللہ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنی کروٹوں کے بل۔'' ﴿وَ مَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ﴾ (18/الکہف:63) ''اور نہیں بھلائی مجھے وہ بات مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں۔''

اُذْكُرْ ج: اُذْكُرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو یاد کر۔ ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً﴾ (7/الاعراف:205) ''اور تو یاد کر اپنے رب کو اپنے جی میں گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے۔'' اُذْكُرُوْا آیت زیر مطالعہ میں استعمال ہوا ہے۔

ذَاكِرٌ ج: ذَاكِرُوْنَ۔ ذَاكِرِيْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ مذکر کا صیغہ۔ یاد کرنے والا۔ ذکر کرنے والا۔ ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝﴾ (11/ھود:114) ''بے شک نیکیاں لے جاتی ہیں برائیوں کو۔ یہ ایک بڑی نصیحت ہے یاد کرنے والوں کے لیے۔''

ذَاكِرَةٌ ج: ذَاكِرَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ مونث کا صیغہ۔ یاد کرنے والی۔ ذکر کرنے والی۔ ﴿وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ﴾ (33/الاحزاب:35) ''اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے اور ذکر کرنے والیاں۔''

مَذْكُوْرٌ اسم المفعول ہے۔ جس کو یاد کیا جائے۔ جس کا ذکر کیا جائے۔ ﴿لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝﴾ (76/الدھر:1)۔ ''وہ نہیں تھا کوئی قابل ذکر چیز۔''

ذِكْرٌ اسم ذات بھی ہے۔ یاد۔ نصیحت۔ کسی کا ذکر۔ ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝﴾ (20/طٰہٰ:14) ''اور تو قائم کر نماز کو میری یاد کے لیے۔'' ﴿اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (7/الاعراف:63) ''تو کیا تم لوگوں کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس ایک نصیحت تمہارے رب کی طرف سے۔ ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ﴾ (21/الانبیاء:10) ''ہم نے نازل کی ہے تمہاری طرف ایک کتاب، اس میں تمہارا ذکر ہے۔

ذِكْرٰى اسم ذات ہے لیکن اس میں ذِكْرٌ کی بنسبت مبالغہ ہے۔ بڑی نصیحت۔ اوپر ذَاكِرٌ میں آیت نمبر (11/ھود:114) دیکھیں۔

ذَكَرٌ تثنیہ: ذَكَرَانِ، ذَكَرَيْنِ۔ ج: ذُكُوْرٌ ، ذُكْرَانٌ ۔ نر۔ مرد۔ اس کی ضد اُنْثٰی ہے اور یہ عموماً اس وقت استعمال ہوتا ہے جب جنس کا اظہار مقصود ہو۔ خواہ مردوں میں یا حیوانات میں۔ ﴿ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ﴾ (3/آل عمران:195) ''کہ میں ضائع نہیں کرتا تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو، کوئی بھی مرد ہو یا عورت۔'' ﴿ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ ﴾ (6/الانعام:143) ''آپؐ کہیے کیا اللہ نے اِن دونوں کو حرام کیا یا دونوں مادہ کو۔'' ﴿ مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا ﴾ (6/الانعام:139) ''جوان مویشیوں کے پیٹ میں ہے وہ صرف ہمارے مردوں کے لیے ہے۔'' ﴿ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (26/الشعراء:165) ''کیا تم بدفعلی کے لیے جاتے ہو مردوں کے پاس ساری مخلوق سے۔'' کنایۃً ذَکَرٌ سے مرد کی شرم گاہ بھی مراد لی جاتی ہے۔

(تفعیل) تَذْكِيْرًا اور تَذْكِرَةً یاد دلانا۔ نصیحت کرنا۔ ﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ﴾ (2/البقرۃ:282) ''کہ بھول جائے ان میں سے ایک تو یاد دلائے ان میں سے دوسری۔'' ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا ﴾ (18/الکہف:57) ''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس کو یاد دلائی جائیں اس کے رب کی نشانیاں اور وہ اعراض کرے ان سے۔'' ﴿ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ (10/یونس:71) ''اے میری قوم اگر تم لوگوں پر بھاری ہے میرا کھڑا ہونا اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے یاد دہانی کرانا۔''

تَذْكِرَةٌ اسم ذات بھی ہے۔ یاد دہانی۔ جس کے ذریعے کسی چیز کو یاد دلایا جائے۔ ﴿ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (69/الحاقۃ:48) ''اور یقیناً وہ یعنی قرآن مجید یاد دہانی ہے متقی لوگوں کے لیے۔''

ذَكِّرْ فعل امر ہے۔ تو یاد دہانی کرا۔ ﴿ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴾ (88/الغاشیۃ:21) ''آپؐ یاد دہانی کرائیے آپؐ تو بس یاد دہانی کرانے والے ہیں۔''

مُذَكِّرٌ اسم الفاعل ہے۔ یاد دہانی کرانے والا۔ اوپر آیت نمبر (88/الغاشیۃ:21) دیکھیں۔

(تفعّل) تَذَكُّرًا اس کا ماضی تَذَكَّرَ اور اِذَّكَّرَ، مضارع يَتَذَكَّرُ اور يَذَّكَّرُ، نیز مخاطب کے صیغوں میں مضارع تَتَذَكَّرُ اور تَذَكَّرُ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ یاد دہانی حاصل کرنا۔ یاد کرنا۔ نصیحت پکڑنا۔ تَذَكُّرٌ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص غفلت اور بھلاوے میں پڑا ہوا ہو اور چونک کر اُس چیز کو یاد کرلے جس سے غافل تھا۔ ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ ﴾ (20/طٰہٰ:44) ''پس تم دونوں کہنا، اس سے نرم بات شاید کہ وہ نصیحت پکڑے۔'' ﴿ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴾ (87/الاعلیٰ:10) ''وہ نصیحت پکڑے گا جو خوف کرتا ہے۔'' ﴿ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ (10/یونس:3) ''تو کیا تم لوگ نصیحت نہیں پکڑتے۔''

(افتعال) اِدِّكَارًا قرآن مجید میں اس کا استعمال ''ذ'' کو ''د'' میں تبدیل کر کے ہوا ہے جو ایک استثنائی صورت ہے۔ اس لیے اِذِّكَارٌ، اِدِّكَارٌ ہوگیا اور 'ت'، 'د' میں اس لیے تبدیل ہوئی کہ یہ باب افتعال کا خصوصی قاعدہ ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ باب افتعال کے 'ف' کلمہ پر اگر د ، ذ یا ز میں سے کوئی حرف ہو تو افتعال کی ''ت'' وہی حرف بن جاتی ہے اور پھر ادغام کے قواعد کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں چونکہ 'ذ' پہلے 'د' میں تبدیل ہوگئی، اس لیے 'ت' بھی 'د' میں تبدیل ہوگئی اور پھر دونوں کا ادغام ہو گیا۔ نصیحت حاصل کرنا۔ سوچنا۔ غور کرنا۔ یاد کرنا۔ ﴿ وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ ﴾ (12/یوسف:45) ''اور کہا اس نے جس نے نجات پائی ان دونوں میں سے اور اس نے یاد کیا ایک مدت کے بعد۔''

مُّدَّكِرٍ اسم الفاعل ہے۔ نصیحت حاصل کرنے والا۔ یاد کرنے والا۔ ﴿وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ (54/القمر:17) ''اور ہم نے آسان کیا ہے قرآن کو یاددہانی کے لیے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔''

نِعْمَتِيَ اور اَنْعَمْتُ (ن ع م): الفاتحہ آیت 6 دیکھیں۔

و ف ی

(ض) **وَفَاءً** کسی چیز کو مکمل کرنا۔ پورا کرنا۔

اَوْفٰى اَفْعَلُ کے وزن پر افعل التفضیل ہے۔ زیادہ پورا کرنے والا۔ پورا۔ مکمل۔ ﴿وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ (9/توبۃ:111) ''اور کون زیادہ پورا کرنے والا ہے اپنے وعدے کو اللہ سے۔'' ﴿ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴾ (53/النجم:41) ''پھر اُسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔''

(افعال) **اِيْفَاءً** وعدہ، نذر، ناپ تول وغیرہ پورا کرنا۔ ﴿بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (3/آل عمران:76) ''کیوں نہیں! جس نے پورا کیا اپنے عہد کو اور تقویٰ کیا تو بے شک اللہ پسند کرتا ہے متقی لوگوں کو۔'' ﴿اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْۤ اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴾ (12/یوسف:59) ''کیا تم لوگ دیکھتے نہیں کہ میں پورا بھرتا ہوں پیمانے کو اور میں سب سے بہتر مہمان نواز ہوں۔'' ﴿الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ﴾ (13/الرعد:20) ''وہ لوگ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو۔''

اَوْفِ ج: اَوْفُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو پورا کر۔ ﴿فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ﴾ (12/یوسف:88) ''پس آپؑ پورا بھریئے ہمارے لیے پیمانے کو۔'' ﴿فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ﴾ (7/الاعراف:85) ''پس تم لوگ پورا کرو ناپ اور تول کو۔''

لِيُوْفِ ج: لِيُوْفُوْا۔ فعل امر غائب ہے۔ اسے چاہیے کہ پورا کرے۔ ﴿وَ لْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَ لْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴾ (22/الحج:29) ''اور ان لوگوں کو چاہیے کہ پورا کریں اپنی منتوں کو اور طواف کریں قدیم گھر کا۔''

اُوْفِ مضارع مجزوم میں واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ آیت زیرِ مطالعہ۔ (نوٹ: یہاں ایک بات کا خاص خیال رہے۔ وہ یہ کہ فعل امر کے واحد مذکر حاضر کے صیغے میں الف پر زبر آتی ہے (اَوْفِ) اور مضارع مجزوم میں واحد متکلم کے صیغے میں الف پر پیش آتی ہے۔ (اُوْفِ)۔

مُوْفٍ ج: مُوْفُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ پورا کرنے والا۔ ﴿وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ (2/البقرۃ:177) ''اور پورا کرنے والے اپنے عہد کو جب کبھی باہم عہد کریں۔''

(تفعیل) **تَوْفِيَةً** (1) کسی کام کو کامل طور پر پورا کرنا۔ ﴿وَ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ﴾ (53/النجم:37) ''اور ابراہیمؑ کے صحیفوں میں جو پوری طرح (احکام) بجالائے۔''

(2) حق پورا پورا ادا کر دینا۔ ﴿وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ﴾ (3/آل عمران:57) ''اور وہ لوگ کہ جو ایمان لائیں اور عمل کریں نیک تو وہ یعنی اللہ پورا پورا ادا کرے گا ان کو ان کے اجر۔''

يُوَفّٰى مضارع مجہول ہے۔ اُسے دیا جائے گا پورا حق۔ ﴿وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ﴾ (16/النحل:111) ''اور پورا حق دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے عمل کیا۔'' ﴿وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (3/آل عمران:185) ''اور قیامت کے دن تم اپنے بدلے پورے پورے دیے جاؤ گے۔''

يُوَفِّ مضارع مجزوم ہے۔﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا ﴾(11/ھود:15)'' جو چاہتا ہے دنیا کی زندگی کو اور اس کی زینت کو تو ہم پورا حق دیں گے ان کو ان کے اعمال کا اس دنیا میں۔''

مُوَفِّ ج: مُوَفُّوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ پورا دینے والا۔﴿ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴾(11/ھود:109) ''اور ہم اُن سب کو اُن کا پورا پورا حصہ بغیر کسی کمی کے دینے والے ہیں۔''

(تفعّل) تَوَفٍّ اس کے اصل معنیٰ ہیں کسی چیز کو پورا لے لینا، وصول کر لینا اور اس پر کامل طور پر قبضہ کر لینا۔ یہ لفظ کنایۃً 'موت دینا' کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن یہ اس کا حقیقی معنیٰ نہیں بلکہ مرادی اور تعبیری معنیٰ ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ (1) سوتے وقت ظاہری احساس وشعور کو لے لینے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ﴾(6/الانعام:60)''اور وہ وہی ہے جو قبضہ میں لے لیتا ہے تمہیں رات کو اور جانتا ہے جو کمایا تم نے دن کو پھر اٹھاتا ہے تمہیں (نیند سے) دن میں تاکہ پوری کر دی جائے (تمہاری عمر کی) میعاد مقرر۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ (2) موت کے وقت روح کو قبض کر لینے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ ﴾(39/الزمر:42)''اللہ ہی روحوں کو اُن کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی اُنہیں اُن کی نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔ (3) حضرت عیسیٰؑ کو ان کی زندگی میں ان کی روح اور بدن سمیت آسمانوں میں اٹھائے جانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:﴿ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ ﴾(5/المائدۃ:117)''پھر جب تو نے مجھ کو اٹھا لیا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:''اَلتَّوَفِّيْ فِيْ لُغَةِ الْعَرَبِ مَعْنَاهَا الْقَبْضُ وَالْاِسْتِيْفَاءُ وَ ذٰلِكَ ثَلَاثَةُ اَنْوَاعٍ، اَحَدُهَا التَّوَفِّيْ فِي النَّوْمِ وَالثَّانِيْ تَوَفِّي الْمَوْتِ وَالثَّالِثُ تَوَفِّي الرُّوْحِ وَالْبَدَنِ جَمِيْعًا۔'' (معارف القرآن، ج۲،ص۷۳)''التوفی کا معنی لغتِ عرب میں قبض کرنے اور پورا لینے کے ہیں۔ اور اس کی تین قسمیں ہیں۔ نیند میں وصول کرنا، موت کے وقت وصول کرنا اور روح اور بدن کا مکمل وصول کرنا۔'' اور کلیات ابو بقاء میں ہے:''اَلتَّوَفِّيْ اَلْاِمَاتَةُ وَقَبْضُ الرُّوْحِ وَعَلَيْهِ اسْتِعْمَالُ الْعَامَّةِ اَوِ الْاِسْتِيْفَاءُ وَاَخْذُ الْحَقِّ وَ عَلَيْهِ اسْتِعْمَالُ الْبُلَغَاءِ''''توفی'' کا لفظ عوام کے یہاں موت دینے اور جان لینے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن بلغاء کے نزدیک اس کے معنی ہیں پورا وصول کرنا اور ٹھیک لینا۔'' (تفسیر عثمانی، ص۷۴)۔ حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں:''موت اور نوم میں لفظ''توفی'' کا استعمال قرآن کریم ہی نے شروع کیا ہے۔ جاہلیت والے تو عموماً اس حقیقت سے ہی ناآشنا تھے کہ موت یا نوم میں خدا تعالیٰ کوئی چیز آدمی سے وصول کر لیتا ہے اسی لیے لفظ''توفی'' کا استعمال موت اور نوم پر اُن کے یہاں شائع نہ تھا قرآن کریم نے موت وغیرہ کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کے لیے اول اس لفظ کا استعمال شروع کیا۔ تو اسی کو حق ہے کہ موت ونوم کی طرح اخذ روح مع البدن کے نادر مواقع میں بھی اسے استعمال کر لے۔'' (تفسیر عثمانی، ص۷۴)۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں تو توفی کے معنی ''لے لینے، قبض کر لینے'' کے بہت واضح ہیں چنانچہ فرمایا:﴿ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ ﴾(4/النساء:15)''پھر اگر وہ گواہی دیویں تو بند رکھو اُن عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ اٹھا لیوے اُن کو موت۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

تَوَفَّ — فعل امر ہے۔تو موت دے۔﴿ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴾(3/آل عمران:193)''اے ہمارے رب پس تو بخش دے ہمارے لیے ہمارے گناہوں کو اور تو دور کر دے ہم سے ہماری برائیوں کو اور تو موت دے ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ۔''

يُتَوَفّٰى — ج:يُتَوَفَّوْنَ۔مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔اسے لیا جاتا ہے۔اُسے موت دی جاتی ہے۔﴿ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى ﴾(22/الحج:5)''اور کوئی تم میں سے قبضہ کر لیا جاتا ہے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)''اور تم میں سے وہ بھی ہیں جو مر جاتے ہیں۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ ﴾(2/البقرۃ:243)''اور وہ جنہیں موت دی جائے تم میں سے یعنی تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں۔''

مُتَوَفِّيْ — اسم الفاعل ہے۔حق پورا لینے والا۔موت دینے والا۔﴿ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ ﴾(3/آل عمران:55)''جب کہا اللہ نے اے عیسیٰؑ میں پورا لینے والا ہوں آپ کو اور اٹھانے والا ہوں آپ کو اپنی طرف۔''

(استفعال) اِسْتِيْفَاءً — پورا پورا لینا۔﴿ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۖ ﴾(83/المطففین:2)''وہ جب لوگوں سے ناپ لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔''

عَهْدٌ(ع ھ د):البقرۃ آیت 27 دیکھیں۔

ر ھ ب

(س) رَهْبَةً — کسی کی عظمت اور جلالت کے تصور سے دل پر لرزش اور کپکپی طاری ہونا۔خوف محسوس کرنا۔ڈرنا۔﴿ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴾(7/الاعراف:154)''اور ان تختیوں کی تحریر میں ہدایت ہے اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔''

اِرْهَبْ — ج:اِرْهَبُوْا۔فعل امر ہے۔تو ڈر۔آیت زیرِ مطالعہ۔

رَهَبٌ، رَهْبَةٌ، رَهْبٌ — اسم ذات ہیں۔ڈر۔خوف۔ایسا ڈر یا خوف جو کسی کی عظمت اور جلالت کے تصور سے دل پر طاری ہو اور امام راغبؒ کے مطابق ایسا ڈر یا خوف جس میں احتیاط اور بے چینی دونوں شامل ہوں۔﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ ﴾(21/الانبیاء:90)''بے شک وہ لوگ باہم سبقت کرتے تھے بھلائی میں اور ہم کو پکارتے تھے توقع کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے۔''﴿ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ﴾(59/الحشر:13)''بے شک تم لوگ زیادہ ہو بلحاظ خوف کے ان کے سینوں میں بنسبت اللہ کے۔''﴿ وَّ اضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ ﴾(28/القصص:32)''اور ملا لیں اپنی طرف اپنے بازو خوف سے(بچنے کے لیے)۔''

رَاهِبٌ — ج:رُهْبَانٌ۔اللہ سے بہت ڈرنے والا۔درویش۔تارکِ دنیا۔یہود میں جو لوگ خدا ترس تھے ان کو راہب کہتے تھے۔یہ لوگ دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ رہتے اور اپنی خانقاہوں میں ذکر و فکر میں مصروف رہتے۔امت محمدیہؐ میں جو لوگ خدا ترس ہیں ان کو متقی کہتے ہیں۔امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ رُهْبَانٌ، واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔جب واحد استعمال ہو تو اس کی جمع رَهَابِيْنُ آتی ہے۔﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا ﴾(5/الاعراف:82)''یہ اس لیے کہ ان میں عالم ہیں اور درویش ہیں۔''

رَهْبَانِيَّةٌ اِسم ذات ہے۔ اللہ کے ڈر سے ترکِ دنیا۔ گوشہ نشینی۔ صاحبؒ ضیاء القرآن فرماتے ہیں: ''رہبانیت میں دو لغتیں ہیں: رَهْبَانِيَّت (بفتح را) اور رُهْبَانِيَّت (بضم را) پہلی صورت میں یہ رَهْب سے ماخوذ ہوگا جس کا معنی خوف اور ڈر ہے اور دوسری صورت میں یہ رُهْبَان (جو رَاهِبٌ کی جمع ہے) کی طرف منسوب ہوگا۔ پہلی صورت میں اس کا معنی ہے وہ مسلک اور وہ طرزِ حیات جس کی بنیاد خوف اور ڈر پر ہے۔ دوسری صورت میں اس کا معنی ہوگا ان لوگوں کا مسلک اور طرزِ زندگی جو ہر وقت ڈرنے والے اور خوفزدہ رہنے والے ہیں۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں: (رہبانیت کا مطلب ہے) فرطِ خوف سے عبادات و ریاضات میں حد درجہ غلو کرنا۔ علامہ پانی پتیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (رہبانیت کا مطلب ہے) عبادت و ریاضت میں مبالغہ، لوگوں سے قطع تعلق، جائز اور مباح خواہشات کو بھی ترک کر دینا۔ علامہ ابن منظورؒ فرماتے ہیں: (رہبانیت کا مطلب ہے) دنیا کے مشاغل کو ترک کر دینا، اس کی لذتوں کو نظر انداز کر دینا، اہل دنیا سے عزلت گزینی، اپنے آپ کو طرح طرح کی مشقتوں میں مبتلا کر دینا۔'' (ضیاء القرآن، ج۵، ص: ۱۲۷، تلخیصاً)۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''رہبانیت کے معنی ترک لذات و تحمل شدائد (یعنی مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنا) کے ہیں اور بعض اہل لغت کے نزدیک محض زیادتی اور افراط کے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۱۰۷۴)۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''شریعت حقہ اسلامیہ نے اس اعتدال فطری سے متجاوز رہبانیت کی اجازت نہیں دی۔ ہاں بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ ''اس اُمت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے'' کیونکہ مجاہد اپنے سب حظوظ و تعلقات سے واقعی الگ ہو کر اللہ کے راستہ میں نکلتا ہے۔'' (تفسیر عثمانی، ص ۷۱۸)۔ ﴿وَ رَهْبَانِيَّةَ ۟ اِبْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ (57/الحدید:27) ''اور دنیا سے کنارہ کشی! انہوں نے ابتدا کی اس کی، ہم نے اس کو فرض نہیں کیا ان پر۔''

(افعال) اِرْهَابًا کسی پر رعب ڈالنا۔ دھاک بٹھانا۔ کسی کو خوف زدہ کرنا۔ ﴿تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ (8/الانفال:60) ''تم لوگ رعب رکھتے ہو اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر۔''

(استفعال) اِسْتِرْهَابًا خوفزدہ کرنا۔ ڈرانا۔ ﴿سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ﴾ (7/الاعراف:116) ''انہوں نے جادو کیا لوگوں کی آنکھوں پر اور ان کو خوفزدہ کیا۔''

ترکیب 'یَا' حرف ندا ہے۔ بَنِیْ اِسْرَاءِیْلَ مرکب اضافی ہے۔ اِبْنٌ کی جمع سالم حالت رفع میں بَنُوْنَ اور نصب و جر میں بَنِیْنَ آتی ہے۔ یہ جب مضاف بنتے ہیں تو نون اعرابی گر جاتا ہے۔ اصل مرکب تھا بَنُوْ اِسْرَاءِیْلَ۔ اس پر حرف ندا 'یَا' داخل ہوا تو اس نے مضاف کو نصب دی۔ اس طرح یہ بَنِیْ اِسْرَاءِیْلَ ہوگیا۔ اِسْرَاءِیْلَ مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہے اور چونکہ یہ غیر منصرف ہے اس لیے حالت جر میں 'لَ' پر ایک زبر آئی۔

اُذْكُرُوْا فعل امر ہے اور نِعْمَتِیَ اس کا مفعول ہے۔ یہ دراصل نِعْمَتِیْ تھا۔ قاعدہ یہ ہے کہ یائے متکلم کو آگے ملانے کے لیے اگر حرکت دینی ہو تو اسے فتحہ دیتے ہیں۔ چنانچہ آگے اَلَّتِیْ سے ملانے کے لیے نِعْمَتِیْ کے بجائے نِعْمَتِیَ استعمال ہوا۔ اَلَّتِیْ اسم موصول ہے اور اَنْعَمْتُ، ماضی میں واحد متکلم کا صیغہ ہے اور اِس کا فاعل اس میں ضمیر اَنَا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور عَلَيْكُمْ، جار مجرور متعلق فعل ہے۔ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ، صلہ ہے اَلَّتِیْ کا اور صلہ اور موصول مل کر صفت ہے نِعْمَةً کی۔

'وْ' حرف عطف ہے اور اَوْفُوْا عطف ہے اُذْكُرُوْا پر۔ اَوْفُوْا فعل امر ہے۔ اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر اس کا فاعل ہے اور بِعَهْدِیْ میں 'بِ' حرف جار اور عَهْدِیْ، مضاف، مضاف الیہ ہے اور یہ مرکب جاری متعلق فعل ہے۔ آگے اُوْفِ دراصل مضارع میں واحد متکلم کا صیغہ اُوْفِیْ تھا۔ جواب امر ہونے کی وجہ

سے مضارع مجزوم ہوا تو ’’ی‘‘ گر گئی۔ اس لیے اُوْفِ استعمال ہوا اور بِعَھْدِکُمْ متعلق ہے اُوْفِ سے۔

آگے اِیَّایَ میں ی متکلم مفعول بہ ہے اِرْھَبُوْا کا جس کو تاکید کے لیے پہلے لایا گیا ہے بالکل اسی طرح جیسے سورہ الفاتحہ میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہے۔ اور یاد کر لیجئے کلمہ ’اِیَّا‘ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب ضمائر منصوبہ متصلہ یعنی ضمیر مفعولی کو منفصل لکھنا ہو۔ اس سے عموماً تاکید کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ فَارْھَبُوْنِ میں ’ف‘ زائدہ ہے اور اِرْھَبُوْا فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر اَنْتُمْ ہے اور آگے ’نِ‘ دراصل نونِ وقایہ ہے۔ یہ جملہ اِرْھَبُوْیْ تھا۔ اِرْھَبُوْا کے واوالجمع کا الف ضمیر لگنے کی وجہ سے گر گیا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب امر کے صیغے کے بعد ’ی‘ متکلم آئے تو اس پر ایک ’ن‘ داخل کر دیتے ہیں جسے ’ن‘ وقایہ کہتے ہیں۔ وقایہ کا معنی ہے ’بچانا‘ اور یہ نون فعل امر کے آخری حرف ساکن اور یاء ساکن کے ذریعے پیدا ہونے والے ’’التقاء ساکنین‘‘ سے بچانے کے لیے لگتا ہے۔ چنانچہ ’ن‘ وقایہ داخل کرنے کے بعد یہ اِرْھَبُوْنِیْ بن گیا۔ اور جب ضمیر مفعولی نِیْ کے آگے وقف کرنا ہو تو عموماً اس کی ’ی‘ کو گرا دیتے ہیں اور ’ن‘ وقایہ کو بڑا کر کے لکھ دیتے ہیں۔ اس کی پہچان ’ن‘ کی زیر سے ہوتی ہے۔ یہاں ایک بات اور نوٹ کیجئے، اگر جملہ یہ ہوتا اِیَّایَ فَارْھَبُوْا، تو بھی اس میں تاکید کا مفہوم ہوتا لیکن یہاں ضمیر منفصل کے بعد فعل امر اِرْھَبُوْا کے ساتھ ایک اور ضمیر مفعولی لائی گئی جس سے نہایت تاکید کا اسلوب پیدا ہوا ہے۔ اردو زبان میں اس اسلوب سے قریب ترین ترجمانی یہ ہوگی ’’اور مجھ ہی سے، مجھ ہی سے تم لوگ ڈرو‘‘ (واللہ اعلم)

ترجمہ	یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ	اذْكُرُوْا	نِعْمَتِیَ	الَّتِیْٓ	اَنْعَمْتُ
البقرۃ:40	اے اسرائیل کے بیٹو	تم لوگ یاد کرو	میری نعمت کو	جس کو	میں نے انعام کیا

عَلَیْكُمْ	وَ اَوْفُوْا	بِعَهْدِیْٓ	اُوْفِ	بِعَهْدِكُمْ ۚ
تم لوگوں پر	اور تم لوگ پورا کرو	میرے (ساتھ کیے ہوئے) وعدہ کو	تو میں پورا کروں گا	تمہارے (ساتھ کیے ہوئے) وعدہ کو

وَاِیَّایَ	فَارْهَبُوْنِ ۝
اور صرف مجھ سے ہی	تم لوگ ڈرو مجھ سے

نوٹ:1 اس آیت سے بنواسرائیل کی فردِ جرم کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے چند بنیادی باتیں ذہن نشین ہونا ضروری ہیں۔

(۱) ہم سے پہلے بنواسرائیل امت مسلمہ کے عہدے پر فائز تھے۔ پھر انہیں معزول کر کے امت محمد ﷺ کو اس عہدے پر فائز کیا گیا۔ چنانچہ اس فردِ جرم (Charge Sheet) کے ذریعے بنواسرائیل پر ان کی معزولی کے سلسلہ میں حجت قائم کی گئی ہے۔

(۲) ہمارے حوالے سے اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کان کھول رہا ہے کہ اگر تم ایسے کام کرو گے تو تم بھی انہی کی طرح دنیا اور آخرت میں ذلیل و رسوا ہو گے۔ اس لیے یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ اس فردِ جرم کا مطالعہ کرتے وقت اگر ہم بنواسرائیل کو برا بھلا کہتے رہے اور خود کو پارسا سمجھتے رہے تو پھر ہم ہدایت سے محروم رہیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس فردِ جرم کے آئینے میں ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں اور اپنی اصلاح کی فکر کریں۔ اسی صورت میں یہ فردِ جرم قرآن مجید میں نقل کرنے کا مقصد پورا ہوگا۔

(۳) بنواسرائیل کی فردِ جرم میں بھی اور قرآن مجید کے دیگر مقامات میں جہاں تاریخی واقعات کا ذکر ہے، وہاں عام طور پر آپ کو ترتیب زمانی نہیں ملے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخی واقعات اس ترتیب سے نہیں بیان کیے گئے جس ترتیب سے وہ وقوع پذیر ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید تاریخ کی تعلیم دینے والی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہدایت دینے کے لیے نازل کی گئی ہے۔ اور اس مقصد کے تحت تاریخی واقعات کو استدلال یا ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ تاریخی حوالہ دیتے وقت موضوع سے اس کی مناسبت کو پیش نظر رکھا گیا ہے نہ کہ زمانے کی ترتیب کو۔ (از لطف الرحمٰن خان صاحب)

نوٹ:2 آیت زیرِ مطالعہ میں جس عہد کا ذکر آیا ہے اِس کی تفصیل بعض علماء کے نزدیک آل عمران کی آیت 81 میں بیان کی گئی ہے، بعض علماء کے نزدیک المائدہ کی آیت 12 میں اور بعض علماء کے مطابق اس عہد کا ذکر توراۃ کی کتاب استثناء، باب 15، آیت نمبر 18، 19 میں آیا ہے۔ (واللّٰہ اعلم)۔

آیت: 41

﴿ وَ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۪ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝۴۱ ﴾

اٰمِنُوْا (ء م ن): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔ اَنْزَلْتُ (ن ز ل): البقرۃ آیت 4 دیکھیں۔
مُصَدِّقًا (ص د ق): البقرۃ آیت 23 دیکھیں۔ تَكُوْنُوْٓا (ك و ن): البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔

ء و ل

(ن) اَوْلًا اور مَآلًا لوٹنا۔ کسی چیز کا اپنے اصل کی طرف واپس ہونا۔ اس مادہ سے کوئی فعل قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

اٰلٌ اسم صفت ہے۔ کسی کے ساتھ تعلق والا۔ ساتھی۔ پیروکار۔ Follower۔ اٰلٌ کی اصل کیا ہے اس کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ دراصل اَوْلٌ تھا۔ جس کے معنیٰ لوٹنے کے ہیں۔ 'وْ' کو الف سے بدلا گیا تو آالٌ بن گیا۔ اس کو پھر الف کے اوپر کھڑی زبر کے ساتھ اٰلٌ لکھا جاتا ہے اور معنیٰ یہ ہوئے کہ جو شخص کسی کی طرف اس کی قرابت اور دوستی کی وجہ سے لوٹے وہ اس کے اٰلٌ میں سے ہے۔ اٰلٌ کا لفظ ہمیشہ اسم عَلَم کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ اس کی اضافت غیر ذوی العقول، اسم نکرہ یا ضمیر کی طرف جائز نہیں۔ چنانچہ اٰلُ رَجُلٍ بولنا جائز نہیں۔ اس کی اضافت کسی قابل تعظیم اور معروف ہستی کی طرف ہوتی ہے جیسے اٰل محمدؐ، اٰل ابراہیمؑ اور اٰل عمران وغیرہ۔ لیکن اٰل الخیاط یا اٰل الحجام نہیں بولتے۔ اور فرعون چونکہ کوئی قابل تعظیم ہستی نہیں اس لیے جب اٰل فرعون کہا جائے تو وہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ فرعون اسم عَلَم بھی ہے اور اپنے کفر کی وجہ سے ایک معروف ہستی بھی ہے۔ عربی زبان میں اٰل کے قریب المعنی ایک لفظ اَھْلٌ بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اِن دونوں میں کچھ فرق ہیں۔ مثلاً: (1) اَھْلٌ کا دائرہ اس لحاظ سے محدود ہے کہ اس میں کسی شخص کے صرف گھر والے یعنی اس کے بیوی بچے سمجھے جاتے ہیں خواہ وہ اس شخص کے ساتھی ہوں یا نہ ہوں، جبکہ کسی شخص کی اٰل میں وہ سب لوگ سمجھے جاتے ہیں جو اس کے ساتھی، مددگار اور اس سے ذہنی یگانگت رکھنے والے ہوں خواہ وہ اس کے رشتے دار ہوں یا نہ ہوں۔ چنانچہ اہل فرعون سے صرف اس کے گھر والے مراد ہوں گے اور اٰل فرعون سے مراد اس کے گھر میں سے اس سے متفق رشتے دار، اس کے اہل کار اور وہ تمام لوگ شامل ہوں گے جو حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں فرعون کے ساتھی اور مددگار تھے۔ حضرت آسیہ سلامٌ علیہا (فرعون کی بیوی)، فرعون کے اہل میں سے تو ہیں لیکن اس کی اٰل میں شامل نہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کی قوم میں سے قارون، اٰل فرعون میں سے تھا۔ اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اٰل محمدؐ سے ہر وہ شخص خارج ہے جو حضورؐ کے طریقے پر نہ ہو،

خواہ وہ خاندانِ رسالت کا کوئی فرد ہی کیوں نہ ہو۔اور اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلتا ہو چاہے اس کا حضورؐ سے کوئی نسبی تعلق نہ بھی ہو۔(۲) اَھْلٌ کا دائرہ اس لحاظ سے **وسیع** ہے کہ یہ غیر ذوی العقول، معرفہ، نکرہ اور ضمیر کی طرف بھی مضاف ہو جاتا ہے۔کسی شہر کی طرف نسبت کریں گے تو اَھْلٌ استعمال کریں گے جیسے اہل مدینہ، اہل بلد وغیرہ۔کسی پیشے کی طرف نسبت کریں گے تو بھی اَھْلٌ استعمال ہوتا ہے۔مثلاً اھل الخیاط، (درزی کے گھر والے) اھل الحجام (نائی کے گھر والے) وغیرہ۔لیکن اٰل البلد یا اٰل الارض وغیرہ کے الفاظ نہیں بولے جاتے۔

اَوَّلُ پہلا۔ج:اَوَّلُوْنَ۔اَوَّلِیْنَ۔مؤنث:اُوْلٰی۔پہلی۔یہ افعل التفضیل میں اَفْعَلُ کے وزن پر صیغہ صفت ہے۔اصل میں اَءْوَلُ بنتا ہے۔پھر مہموز کے لازمی قاعدے کے تحت اس کو اٰوَلُ لکھا جاتا ہے لیکن کثرتِ استعمال کی وجہ سے ہمزہ کا واؤ میں ادغام کر کے اَوَّلُ لکھا اور بولا جاتا ہے۔ ﴿وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۱۴۳﴾(7/الاعراف:143)''اور میں ایمان لانے والوں کا پہلا ہوں۔'' ﴿اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۝۱۸﴾ (87/الاعلی:18)''بے شک یہ پہلے صحیفوں میں ہے۔''اَوَّلُ کا استعمال تین طرح سے ہوتا ہے۔(1) عددی ترتیب کے لحاظ سے یعنی وہ عدد جس سے پہلے کوئی عدد نہیں۔اس لحاظ سے اوّل کے بعد ثانی۔پھر ثالث وغیرہ آتا ہے۔ (2) ترتیب کار یا نظامِ صناعی کے لحاظ سے جیسے اَلْاَسُّ اَوَّلًا ثُمَّ الْبِنَاءُ یعنی پہلے بنیاد رکھی جائے گی پھر تعمیر ہوگی۔(3) ترتیب زمانی کے لحاظ سے۔اس لحاظ سے اوّل کی ضد اٰخِرٌ بمعنی پچھلا ہے۔اور اُولی (پہلی۔دنیا) کی ضد اٰخِرَت (پچھلی۔اخروی زندگی) ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ ۝۴۹ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝۵۰﴾(56/الواقعۃ:49، 50)''آپؐ فرما دیجیے بے شک اگلوں کو بھی اور پچھلوں کو بھی سب کو جمع کیا جائے گا ایک مقررہ وقت پر ایک جانے ہوئے دن میں۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)

اگر اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو جیسے ھُوَ الْاَوَّلُ تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس سے پہلے کوئی چیز موجود نہ ہو۔ اور یہ بھی نوٹ کیجئے کہ اَوَّلُ کا لفظ عموماً جمع کی طرف مضاف ہوتا ہے۔جیسے اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ یا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ وغیرہ۔

اُولُوْا والے۔یہ جمع ہے اور اس کی واحد نہیں آتی۔یہ ہمیشہ مضاف استعمال ہوتا ہے اور حالت رفع میں اُولُوْا اور حالت نصب وجر میں اُولِیْ لکھا جاتا ہے۔﴿قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ﴾(27/النمل:33)''انہوں نے کہا ہم قوت والے ہیں۔''﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ﴾(17/بنی اسرائیل:5)''پھر جب آیا پہلا وعدہ بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی والے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

مؤنث: اُولَاتٌ۔والیاں۔حالت رفع میں اُولَاتُ اور حالت نصب وجر میں اُولَاتِ لکھا جاتا ہے۔﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ﴾(65/الطلاق:4)''اور حمل والیاں یعنی حاملہ عورتوں کی میعاد ان کے بچہ جننے تک ہے۔''

اُولَآءِ یہ سب۔جمع قریب کے لیے اسم اشارہ ہے۔مذکر مؤنث دونوں کے لیے آتا ہے۔﴿هَاۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ﴾(3/آل عمران:119)''سنو! تم تو یہ ہو کہ محبت کرتے ہو ان سے اور وہ محبت نہیں کرتے تم سے۔''﴿قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤی اَثَرِیْ﴾(20/طٰہٰ:84)''حضرت موسیٰؑ نے عرض کی وہ یہ ہیں میرے پیچھے۔''(نوٹ:اُولَآءِ

کے شروع میں 'هَا' داخل کرنے سے یہ هٰٓاُولَاءِ بن جاتا ہے۔ جسے پھر هٰٓؤُلَاۗءِ لکھا جاتا ہے اور یہ بھی جمع قریب کے لیے اشارہ ہے۔ اِس کے آخر میں کاف خطاب لگانے سے یہ اُولَاءِكَ بن جاتا ہے۔ جسے پھر اُولٰٓئِكَ لکھا جاتا ہے اور یہ اشارہ بعید کے لیے استعمال ہوتا ہے۔)

(تفعیل) تَاْوِيْلًا کسی چیز کو اس کے اصل کی طرف لوٹانا۔ کسی بات یا واقعہ کا انجام بتانا۔ اس باب سے بھی قرآن مجید میں فعل استعمال نہیں ہوا۔

تَاْوِيْلٌ مصدر کے علاہ اسم ذات بھی ہے۔ کسی چیز کا آخری انجام۔ اخیر نتیجہ۔ خواب کی تعبیر۔ کسی شے کو خواہ وہ شے علم ہو یا فعل، اس کی اصل مراد کی طرف لوٹانے کا نام تاویل ہے۔ علم کی مثال جیسے فرمایا: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ﴾ (3/آل عمران:7) ''حالانکہ کوئی اس کا صحیح مطلب نہیں جانتا سوائے اللہ کے۔'' اور فعل کی مثال: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ﴾ (7/الاعراف:53) ''ان لوگوں کو اور کسی بات کا انتظار نہیں صرف اس کے اخیر نتیجے کا انتظار ہے۔'' اس آیت کے تحت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''تَاْوِيْلَهٗ۔ یعنی وعدۂ سزا کے عملی ظہور اور قرآن کے بتائے ہوئے مصداق کے۔ تاویل سے مراد وعید قرآنی کے آخری نتیجہ کے ہیں۔'' اور صاحبؒ احسن البیان فرماتے ہیں: ''تاویل کا مطلب ہے، کسی چیز کی اصل حقیقت اور انجام۔ یعنی کتاب الٰہی کے ذریعے سے وعدے، وعید اور جنت و دوزخ وغیرہ کا بیان تو کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ اس دنیا کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے منتظر تھے، سو اب وہ انجام ان کے سامنے آ گیا۔'' ﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝﴾ (4/النساء:59) ''یہ بہتر ہے اور اچھا ہے بلحاظ انجام کار کے۔'' ﴿وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ﴾ (12/یوسف:21) ''اور اس طرح ہم نے سکونت دی یوسفؑ کو زمین میں اور تاکہ ہم سکھائیں ان کو خوابوں کی تعبیر۔''

كَافِرٌ (ك ف ر): البقرۃ آیت 6 دیکھیں۔ تَشْتَرُوْا (ش ر ی): البقرۃ آیت 16 دیکھیں۔ اٰيٰتٌ: نوٹس کے آغاز میں دیکھیں۔

ث م ن

(ض۔ن) ثَمْنًا کسی چیز کا آٹھواں حصہ لینا۔

(ک) ثَمَانَةً کسی چیز کا قیمتی ہونا۔

ثَمَنٌ اسم ذات ہے۔ قیمت۔ بیچنے والا جو کچھ فروخت شدہ چیز کے بدلے میں لیتا ہے خواہ نقد ہو یا سامان، وہ ثمن کہلاتا ہے اور ہر وہ چیز جو کسی چیز کے عوض حاصل کی جائے اُسے بھی ثمن کہتے ہیں۔ ﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ﴾ (12/یوسف:20) ''اور انہوں نے بیچا اس کو کم قیمت میں۔''

ثَمَانِيَةٌ اور ثَمَانٍ یا ثَمَانِ آٹھ (۸)۔ اسم عدد ہے۔ ثَمَانِيَةٌ مذکر معدود کے لیے آتا ہے اور ثَمَانِ مونث معدود کے لیے آتا ہے۔ ﴿وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۭ﴾ (39/الزمر:6) ''اور اس نے اتارے تمہارے لیے چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے۔'' ﴿اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ﴾ (28/القصص:27) ''کہ تم ملازمت کرو میری آٹھ سال۔''

ثَمَانُوْنَ اور ثَمَانِيْنَ اسّی (۸۰)۔ ثَمَانُوْنَ (رفع)۔ ثَمَانِيْنَ (نصب اور جر) ﴿فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً﴾ (24/النور:4) ''تو تم لوگ مارو ان کو اسّی کوڑے۔''

ثَامِنٌ ترتیب میں آٹھواں۔﴿وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ﴾(18/الکہف:22)''وہ لوگ کہیں گے سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔''

ثُمُنٌ آٹھواں حصہ یعنی 1/8۔﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾(4/النساء:12)''پھر اگر تمہاری اولاد ہے تو ان کے لیے آٹھواں حصہ ہے اس میں سے جو تم نے چھوڑا۔''

ق ل ل

(ض) قِلَّةٌ (۱) کسی چیز کا کم ہونا۔(۲) کسی چیز کا بلند ہونا (ہلکی چیز اوپر اٹھتی ہے)۔﴿وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ﴾(4/النساء:7)''اور عورتوں کے لیے ایک حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑا والدین اور قرابت داروں نے، خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔''

قَلِيْلٌ ج: قَلِيْلُوْنَ- فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔کم۔تھوڑا۔﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝﴾(11/ھود:40)''اور ایمان نہیں لائے اس کے ساتھ مگر تھوڑے سے لوگ۔''﴿اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ۝﴾(26/الشعراء:54)''اور یقیناً یہ گروہ بہت ہی کم تعداد میں ہے۔''

قَلِيْلَةٌ قَلِيْلٌ کی مؤنث۔تھوڑی۔﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾(2/البقرۃ:249)''بارہا چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے۔''

اَقَلُّ اسم التفضیل ہے۔کسی سے کم یا سب سے کم۔﴿فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا ۝﴾(72/الجن:24)''پس وہ لوگ جان لیں گے کہ کون زیادہ کمزور ہے بلحاظ مددگار کے اور زیادہ کم ہے بلحاظ گنتی کے۔''

(افعال) اِقْلَالًا کسی کو ہلکا پانا۔ہلکا سمجھنا۔بلند کرنا۔اٹھا لینا۔﴿حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا﴾(7/الاعراف:57)''یہاں تک کہ جب بھی وہ ہوا بلند کرتی ہے بھاری بادل کو۔''امام راغبؒ فرماتے ہیں:''یہاں اَقَلَّتْ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے کہ وہ بادل جن کو (ہوا) اٹھا کر لاتی ہے اگرچہ فی نفسہٖ بھاری ہوتے ہیں مگر ہوا کی قوت کے اعتبار سے نہایت ہلکے ہیں۔''(مفردات القرآن، ۲ص ۸۶۴)۔اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا یعنی ہوا بادل کے اجزاء کو باہم ملائے رہتی اور انہیں فضا میں معلق رکھتی ہے۔''

(تفعیل) تَقْلِيْلًا کم کرنا۔﴿وَيُقَلِّلُكُمْ فِيْۤ اَعْيُنِهِمْ﴾(8/الانفال:44)''اور اس نے کم کیا تمہیں ان کی آنکھوں میں۔''

اِتَّقُوْا (و ق ی): البقرۃ آیت 2 دیکھیں۔

ترکیب 'وٗ' عطف کا ہے۔اٰمِنُوْا فعل امر ہے اور یہ گزشتہ آیت میں اَوْفُوْا پر عطف ہے۔اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر ہے۔بِمَا میں 'بِ' حرف جار ہے، مَا اسم موصول ہے اور اَنْزَلْتُ، صلہ ہے۔صلہ اور موصول مل کر مجرور ہیں 'بِ' کی وجہ سے اور یہ مرکب جاری متعلق ہے اٰمِنُوْا سے اور اس میں اشارہ ہے قرآن کی طرف۔مُصَدِّقًا حال ہے، اسم موصول 'مَا' کا اور آگے مرکب جاری لِمَا مَعَكُمْ متعلق ہے مُصَدِّقًا سے اور اس میں اشارہ ہے تورات کی طرف۔'وٗ' عطف کا ہے اور لَا تَكُوْنُوْٓا، كَانَ کا فعل نہی ہے، اس کا اسم اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر ہے اور اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ اس کی خبر ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کا مضاف اَوَّلَ حالت نصب میں ہے۔اَوَّلَ کا لفظ عموماً جمع کی طرف مضاف ہوتا ہے مثلاً اوّلُ المسلمین، اوّلُ المومنین وغیرہ لیکن یہاں کافرین یا کفّار کی بجائے کافر واحد آیا ہے اس کا جواب صاحبؒ تفسیر ماجدیؒ اور صاحبؒ تفسیر حقانی کے مطابق یہ ہے کہ کافر صورۃً واحد ہے لیکن معنیً جمع ہے اور تقدیر کلام میں

ایک مضاف محذوف ہے یعنی اَوَّلَ فَرِیْقٍ کَافِرٍ بِہٖ یعنی سب سے پہلے انکار کرنے والا گروہ نہ بنو۔ بِہٖ میں ضمیر قرآن کے لیے ہے۔ آگے وَلَا تَشْتَرُوْا میں وْ عطف کا ہے اور لَا تَشْتَرُوْا ، لَا تَکُوْنُوْا پر عطف ہے۔ لَا تَشْتَرُوْا فعل نہی اور اَنْتُمْ کی ضمیر اس کا فاعل ہے۔ بِاٰیٰتِیْ متعلق فعل ہے۔ اٰیٰتِیْ پر بِ کا صلہ بتا رہا ہے کہ اس کے بدلے کچھ حاصل کرنے سے منع کیا ہے۔ ثَمَنًا قَلِیْلًا مرکب توصیفی مفعول بنفسہ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ چیز ہے جس کو حاصل کرنے سے منع کیا ہے۔ آگے اِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ کی ترکیب بھی وہی ہے جو گزشتہ آیات میں اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں فعل امر اِرْهَبُوْا تھا، یہاں اِتَّقُوْا ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:41

وَاٰمِنُوْا	بِمَا	اَنْزَلْتُ	مُصَدِّقًا
اور تم لوگ ایمان لاؤ	اس (قرآن) پر جو	میں نے نازل کیا	اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والا ہے

لِّمَا	مَعَكُمْ	وَلَا تَكُوْنُوْا	اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ ۠
اس (تورات) کی جو	تمہارے ساتھ ہے	اور تم لوگ مت بنو	سب سے پہلے اس کا انکار کرنے والے

وَلَا تَشْتَرُوْا	بِاٰيٰتِيْ	ثَمَنًا قَلِيْلًا	وَاِيَّايَ
اور تم لوگ مت خریدو	میری آیات کے بدلے	تھوڑی قیمت کو	اور صرف مجھ سے ہی

فَاتَّقُوْنِ
مجھ ہی سے بچتے رہو/ مجھ ہی سے ڈرو

نوٹ :1 آیت مبارکہ میں یہود کو فرمایا وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ ''اور اے یہود تم اس قرآن کے پہلے انکار کرنے والے مت بنو'' جبکہ مشرکین مکہ یہود سے پہلے حضورؐ کی دعوت کا انکار کر چکے تھے تو پھر ایسا کیوں فرمایا؟ اس کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے۔ پہلا یہ کہ اگرچہ مشرکین مکہ، یہود سے پہلے انکار کر چکے تھے مگر ان کا انکار جہالت اور نادانی کی وجہ سے تھا۔ جبکہ یہود حق کو خوب پہنچانتے تھے اور ان کا انکار جانتے بوجھتے تھا۔ علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''یعنی قرآن کی دیدہ و دانستہ تکذیب کرنے والوں میں اوّل مت ہو کہ قیامت تک کے منکرین کا وبال تمہاری گردن پر ہو، اور مشرکین مکہ نے جو انکار کیا ہے وہ جہل اور بے خبری کے سبب کیا ہے دیدہ و دانستہ ہرگز نہ تھا اس میں تو اوّل تم ہی ہو گے اور یہ کفر پہلے کفر سے سخت تر ہے۔'' (تفسیر عثمانیؒ، ص۹)۔ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ہجرت کے بعد، مدینہ میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے قرآن مجید اور حضورؐ کی رسالت کا پہلے انکار کرنے والے یہودی تھے اس لیے ایسے فرمایا۔ (واللّٰہ اعلم)۔

نوٹ :2 تھوڑی قیمت پر فروخت نہ کرو، کا یہ مطلب نہیں کہ زیادہ معاوضہ مل جائے تو احکام الٰہی کا سودا کر لو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ احکام الٰہی کے مقابلے میں دنیاوی مفادات کو اہمیت نہ دو۔ احکام الٰہی تو اتنے قیمتی ہیں کہ ساری دنیا کا مال و متاع بھی ان کے مقابلے میں ثمن قلیل ہے۔

نوٹ :3 آیت نمبر 40 میں وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ فرمایا اور آیت زیر مطالعہ میں وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ فرمایا۔ دونوں کا ترجمہ عام طور پر ''ڈرنا'' سے کیا جاتا ہے۔ انہی کا ایک ہم معنی لفظ ہے خُشُوْع۔ ان تینوں لفظوں کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں: ''رہبت، تقویٰ، خشوع سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ کسی کے عظمت و جلال کے تصور سے دل پر جو لرزش اور کپکپی طاری ہوتی ہے وہ **رہبت** ہے۔ اس لرزش و کپکپی سے صاحب

عظمت وجلال کے لیے دل میں جو عجز وفروتنی اور پستی و نیاز مندی کی حالت پیدا ہوتی ہے اور طبیعت میں بے نیازی کی جگہ فقر کا اور گھمنڈ کی جگہ اخبات کا جو احساس ابھرتا ہے وہ **خشوع** ہے۔ اسی طرح اس صاحب عظمت وجلال کے قہر وغضب سے بچنے، اس کے مقرر کردہ حدود کی مخالفت سے احتراز اور اس کے احکام وآیات کی خلاف ورزی سے اجتناب واحتیاط کی جو بے چینی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے اور جو خلوت وجلوت ہر جگہ آدمی کو بیدار اور چوکنا رکھتی ہے وہ **تقویٰ** ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۱۸۲)

آیت:42

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾﴾

ل	ب	س

(ض) لَبْسًا اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کو چھپا دینا۔ پھر اسی مناسبت سے یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً خلط ملط کرنا۔ گڈ مڈ کرنا۔ مشتبہ کرنا۔ کسی کام کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہو جانا۔ کسی کو کسی معاملے کے بارے میں شبہ میں ڈال دینا (عَلٰی کے صلے کے ساتھ)۔ ﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ (3/آل عمران:71) ''اے اہل کتاب تم لوگ کیوں گڈ مڈ کرتے ہو حق کو باطل کے ساتھ۔'' ﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ﴿٩﴾﴾ (6/الانعام:9) ''اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے کسی فرشتہ کو تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا اور اُن کو اُسی شبہ میں ڈالتے جس میں اب پڑ رہے ہیں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ لَبْسٌ کا لفظ لڑا دینا، بھڑا دینا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ﴿أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ﴾ (6/الانعام:65) ''یا بھڑا دے تم کو مختلف فرقے کر کے اور چکھا دے ایک کو لڑائی ایک کی۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

لَبْسٌ اسم ذات بھی ہے۔ شبہ۔ شک۔ ﴿أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٥﴾﴾ (50/قٓ:15) ''تو کیا ہم تھک گئے پہلی تخلیق سے؟ بلکہ یہ لوگ شک میں ہیں نئی تخلیق کے بارے میں۔''

(س) لُبْسًا پوشاک پہننا۔ کپڑا پہننا۔ ﴿يَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا﴾ (18/الکہف:31) ''اور وہ لوگ پہنیں گے سبز کپڑے۔''

لِبَاسٌ اسم ذات ہے۔ وہ چیز جو پہنی جائے۔ ﴿يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا﴾ (7/الاعراف:26) ''اے آدمؑ کی اولاد ہم نے اتارا ہے تم لوگوں پر ایک لباس، وہ چھپاتا ہے تمہاری بری چیزوں کو اور بطور آرائش کے۔''

لباس کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو انسان کی کمزوریوں اور برے کاموں پر پردہ ڈال سکے۔ اس لیے قرآن مجید میں میاں بیوی میں سے ہر ایک کو دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (2/البقرۃ:187) ''وہ (بیویاں) تمہاری لباس ہیں اور تم ان (بیویوں) کا لباس ہو۔'' ظاہری جسمانی لباس کے علاوہ ایک باطنی لباس بھی ہے جو انسان کے باطن کی زینت وآرائش کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس باطنی لباس کو قرآن لِبَاسُ التَّقْوٰی کہتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ﴾ (7/الاعراف:26) ''اور پرہیز گاری کا لباس، وہ تو سب سے بہتر ہے۔'' حضرت علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''بلکہ اگر غور کیا جائے تو ظاہری بدنی لباس بھی اس

باطنی لباس کو زیب تن کرنے کے لیے شرعاً مطلوب ہوا ہے۔'' اور قرآن مجید میں یہ جو فرمایا: ﴿لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ﴾ (16/النحل:112) ''بھوک اور خوف کا لباس۔'' تو یہ بھوک اور خوف کی شدت کو ظاہر کرنے کے لیے فرمایا، جیسے لباس انسان کے بدن کو ہر طرف سے گھیر لیتا ہے اسی طرح بھوک اور خوف نے ان کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ قرآنِ مجید میں رات کو بھی لباس کہا گیا ہے۔ ﴿وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ﴾ (78/النبا:10) ''اور ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنا دیا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ رات کو لباس اس لیے کہا کہ رات ہر چیز کو اپنی تاریکی کی چادر میں ڈھانپ لیتی ہے۔ یا اس لیے کہ جیسے لباس پہن کر آدمی اپنے آپ کو آرام دہ محسوس کرتا ہے اسی لیے رات کو لباس کہا کیونکہ رات کو ہر جاندار آرام اور سکون محسوس کرتا ہے۔ (واللہ اعلم)

لَبُوْسٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے۔ لغت کے اعتبار سے اس سے مراد ہر طرح کا لباس ہے اور عام طور پر لڑائی کے وقت پہنے جانے والی زرہ کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ﴾ (21/الانبیاء:80) ''اور ہم نے اُنؑ کو زرہ بنانے کا ہنر سکھا دیا تمہارے لیے تاکہ وہ تمہاری حفاظت کرے تمہاری لڑائی میں۔'' اس آیت کے تحت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''لبوس لغت کے اعتبار سے اسلحہ میں سے ہر چیز کو کہا جاتا ہے جو انسان اوڑھ کر یا گلے میں ڈال کر استعمال کرے۔ مراد اس جگہ آہنی زرہ ہے جو جنگ میں حفاظت کے لیے پہنی جاتی ہے۔'' (معارف القرآن، ج۶، ص۲۱۱)

اَلْحَقُّ (ح ق ق): البقرۃ آیت 26 دیکھیں۔

ب ط ل

(ن) بَطْلًا، بُطْلَانًا یہ لفظ حق کی ضد ہے۔ اس لیے سورۃ البقرہ کی آیت:26 میں لفظ حق کی وضاحت پھر دیکھ لیں۔
(۱) ثابت نہ ہونا۔ (۲) جھوٹ ہونا۔ (۳) بے مقصد ہونا۔ بیکار ہونا۔ ضائع ہونا یعنی وجود بے معنی ہونا۔ (۴) واجب نہ ہونا۔ ﴿فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (7/الاعراف:118) ''پس واقع ہوا حق اور ضائع ہوا جو وہ لوگ کیا کرتے تھے۔''

بَاطِلٌ فَاعِلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بے مقصد۔ بیکار۔ ناحق۔ ﴿وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ﴾ (۴/النساء:161) ''اور بسبب ان کے کھانے کے لوگوں کا مال ناحق۔''

(افعال) اِبْطَالًا باطل کرنا۔ ضائع کرنا۔ ﴿قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ﴾ (10/یونس:81) ''حضرت موسیٰؑ نے کہا جو تم لوگ جو لائے ہو، سو وہ جادو ہے۔ بے شک اللہ باطل کرے گا اس کو۔'' ﴿وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ۝﴾ (47/محمد:33) ''اور تم مت ضائع کرو اپنے اعمال۔''

مُبْطِلٌ ج: مُبْطِلُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ باطل کرنے والا۔ ناحق کرنے والا۔ گمراہ۔ ﴿وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ۝﴾ (30/الروم:58) ''اور اگر تم ان کے پاس لاؤ کوئی نشانی تو لازماً کہیں گے وہ جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہو تم لوگ مگر ناحق کرنے والے یعنی گمراہ۔''

تَكْتُمُوا (ك ت م): البقرۃ آیت 33 دیکھیں۔ تَعْلَمُوْنَ (ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ترکیب 'وَ' عطف کا ہے اور لَا تَلْبِسُوْا عطف ہے گزشتہ آیت میں لَا تَشْتَرُوْا پر۔ لَا تَلْبِسُوْا باب ضرب سے فعل نہی ہے۔اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر فاعل ہے، اَلْحَقَّ مفعول اور بِالْبَاطِلِ متعلق فعل ہے۔وَتَكْتُمُوْا میں 'وَ' عطف کا ہے اور تَكْتُمُوْا ،تَلْبِسُوْا پر عطف ہے۔اسی لیے 'لَا' نہی کی وجہ سے مجزوم ہے۔اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر ہے۔اور اَلْحَقَّ اس کا مفعول ہے۔وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ میں 'وَ' حالیہ ہے، اَنْتُمْ مبتدا ہے اور جملہ فعلیہ تَعْلَمُوْنَ اس کی خبر ہے۔یہ جملہ اسمیہ حال ہے تَكْتُمُوْا کی ضمیر فاعلی کا۔

ترجمہ	وَلَا تَلْبِسُوا	الْحَقَّ	بِالْبَاطِلِ	وَتَكْتُمُوا
البقرۃ:42	اورتم لوگ گڈمڈ مت کرو	حق کو	باطل کے ساتھ	اورتم لوگ مت چھپاؤ

الْحَقَّ	وَ	اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾
حق کو	اس حال میں کہ	تم لوگ (اسے) جانتے ہو

نوٹ آیت مبارکہ میں لَا تَلْبِسُوا کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''تلبیس کے اصلی معنیٰ ہیں کسی چیز کو ڈھانپ لینا، چھپا لینا۔ادھوری بات کہنا کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جائے، یا جھوٹ کو لفظی اور ظاہری سچائی کا رنگ دے دینا،بعض اوقات بالکل گھڑے ہوئے جھوٹ سے کہیں بڑھ کر دھوکے اور مغالطہ کا سبب بن جاتا ہے۔اسی سے ملتی جلتی ہوئی شے کا نام آج کی اصطلاح میں پروپیگنڈہ ہے۔موجودہ فرنگیوں کی طرح یہود بھی اس فن میں اُستادرہ چکے ہیں۔'' (تفسیر ماجدیؒ،ص ۲۴)

آیت:43

﴿ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ﴾

اَقِيْمُوا (ق و م): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔ اَلصَّلٰوةَ (ص ل و): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔
اٰتُوا (ء ت ی): البقرۃ آیت 23 دیکھیں۔

ز ك و

(ن) زَكَاءً اس مادے میں دو مفہوم پائے جاتے ہیں۔
(1) پاک ہونا۔عربی زبان میں نفس زکیہ اس نفس کو کہا جاتا ہے جو گناہوں سے پاک ہو۔
(2) بڑھنا۔نشوونما پانا۔زیادہ ہونا۔عربی زبان میں زَكَا الزَّرْعُ کے معنی ہیں کھیتی بڑھی اور پھلی پھولی۔﴿ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ ﴾(24/النور:21) ''اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم لوگوں پر اور اس کی رحمت تو پاک نہ ہوتا تم میں سے کوئی ایک بھی کبھی بھی۔''

اَزْكٰى افعل التفضیل ہے۔زیادہ پاک۔زیادہ ستھرا۔﴿ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ ﴾(2/البقرۃ:232) ''یہ تمہارے لیے پاکیزہ تر ہے اور صاف تر ہے۔''

زَكِيٌّ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔واحد مذکر۔گناہوں سے پاک۔ستھرا۔پاکیزہ۔﴿ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ ﴾(19/مریم:19) ''تاکہ میں عطا کروں تجھ کو ایک پاکیزہ لڑکا۔''

زَكِيَّةٌ فَعِيلَةٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ واحد مونث۔ گناہوں سے پاک۔ ستھری۔ پاکیزہ ﴿قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ﴾ (18/الکہف:74) ''حضرت موسیٰؑ بولے کیا تو نے مار ڈالی ایک جان ستھری بغیر عوض کسی جان کے۔''

(تفعیل) تَزْكِيَةٌ (1) پاک کرنا۔ نشوونما دینا۔ عام طور پر یہ لفظ باطنی صفائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ (24/النور:21) ''اور لیکن اللہ پاک کرتا ہے اُس کو جس کو وہ چاہتا ہے۔'' ﴿يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ (2/البقرۃ:151) ''وہ پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب اور حکمت۔''

(2) اپنی پاکیزگی خود بیان کرنا۔ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ (4/النساء:49) ''کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۧ﴾ (53/النجم:32) ''سو مت بیان کرو اپنی خوبیاں وہ خوب جانتا ہے اس کو جو بچ کر چلا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ نفسِ انسانی کے تزکیے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے تزکیہ بالفعل، یعنی اچھے اعمال کے ذریعے اپنے آپ کو درست کر لینا۔ یہ پسندیدہ بھی ہے اور مطلوب بھی جیسے فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ''وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے آپ کو سنوار لیا۔'' دوسرا ہے تزکیہ بالقول یعنی ایک متقی شخص کا دوسرے شخص کا تزکیہ کرنا اور اس کی خوبیوں کی گواہی دینا۔ قرآن مجید میں نبی اکرمؐ کے فرائض منصبی ایک خاص ترتیب کے ساتھ تین دفعہ بیان ہوئے ہیں جن میں سے ایک تزکیہ ہے۔ مثلاً: (البقرۃ:151) (آل عمران:164) (الجمعہ:2)۔ سورۃ النساء کی آیت:49 اور سورۃ النجم کی آیت 32 میں جس چیز کی مذمت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بعض دفعہ کچھ لوگ اپنے نفس کے تزکیے کے لیے کی جانے والی کوششوں کے نتیجے کو یقینی سمجھ کر خود کو پاک صاف سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی پاکیزگی کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں۔ یہ ہے وہ چیز جس سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اپنی تعریف آپ کرنے کی اکثر وجہ تکبر ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ کہ یہ چیز خلافِ خوفِ الٰہی بھی ہے کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ کس حال میں ہوگا۔ لہٰذا اس چیز سے بچنا چاہیے۔ حدیث میں بھی اس کی ممانعت آئی ہے، ''چنانچہ ایک روایت میں حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسولِ کریمؐ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس وقت چونکہ میرا نام بَرَّۃ تھا (جس کے معنی ہیں گناہوں سے پاک) میں نے وہی بتلایا، تو آپؐ نے فرمایا: لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَهْلِ الْبِرِّ مِنْكُمْ، سَمُّوْهَا زَيْنَبَ (رواہ مسلم بحوالہ مشکوٰۃ) یعنی تم اپنے آپ کی گناہوں سے پاکی بیان نہ کرو کیونکہ یہ علم صرف اللہ ہی کو ہے کہ تم میں سے کون پاک ہے، پھر بَرّہ کے بجائے آپؐ نے زینب نام رکھا۔'' (معارف القرآن، ج۲، ص۴۳۰)۔

زَكٰوةٌ اسم ذات ہے۔ ستھرائی۔ پاکیزگی۔ زکوٰۃ۔ لغات القرآن کے مطابق یہ تَزْكِيَةٌ سے مشتق ہے۔ یہ لفظ اصلاً زَكَوَةٌ ہے جو قاعدہ کے مطابق تبدیل ہو کر زَكَاةٌ بنتا ہے اور قرآن مجید کی خاص املاء میں زَكٰوةٌ لکھا جاتا ہے۔ لغوی اعتبار سے زکوٰۃ کے اندر پاکیزگی اور نشوونما دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اصطلاح شرع میں مال کے اس حصے کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق کسی مال میں سے نکالا جائے اور اس کے احکام کے مطابق خرچ کیا جائے۔ مال کے اس مقررہ حصے کو زکوٰۃ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے نفس اور مال دونوں کو پاکیزگی بھی ملتی ہے اور اس سے مال میں برکت اور بڑھوتری بھی ہوتی ہے۔ ﴿وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ﴾ (2/البقرۃ:277) ''اور اُنہوں نے نماز قائم کی اور

زکوٰۃ ادا کی۔'' ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ﴾ (23/المومنون:4) ''زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں۔'' اس آیت مبارکہ کے تحت مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''عربی زبان میں زکوٰۃ کا مفہوم دو معنوں سے مرکب ہے۔ ایک ''پاکیزگی'' دوسرے ''نشوونما''۔ کسی چیز کی ترقی میں جو چیزیں مانع ہوں اُن کو دور کرنا، اور اس کے اصل جوہر کو پروان چڑھانا، یہ دو تصورات مل کر زکوٰۃ کا پورا تصور بناتے ہیں۔ پھر یہ لفظ جب اسلامی اصطلاح بنتا ہے تو اس کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔ ایک وہ مال جو مقصدِ تزکیہ کے لیے نکالا جائے۔ دوسرے بجائے خود تزکیہ کا فعل اگر يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ کہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ تزکیہ کی غرض سے اپنے مال کا ایک حصہ دیتے یا ادا کرتے ہیں۔ اس طرح بات صرف مال دینے تک محدود ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تزکیہ کا فعل کرتے ہیں، اور اس صورت میں بات صرف مالی زکوٰۃ ادا کرنے تک محدود نہ رہے گی بلکہ تزکیۂ نفس، تزکیۂ اخلاق، تزکیۂ زندگی، تزکیۂ مال، غرض ہر پہلو کے تزکیے تک وسیع ہو جائے گی۔'' (تفہیم القرآن، ج۳، ص ۲۶۳)۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کا لفظ مندرجہ ذیل معنوں میں استعمال ہوا ہے (1) اصطلاحی زکوٰۃ کے لیے جیسے اوپر البقرہ کی آیت 277۔ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر اصطلاحی زکوٰۃ کا ذکر نماز کے ساتھ آیا ہے۔ (2) پاکیزگی کے لیے مثلاً: ﴿فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ۝﴾ (18/الکہف:81) ''پھر ہم نے چاہا کہ بدل دے اُن کو اُن کا رب بہتر اُس سے پاکیزگی میں اور نزدیک تر شفقت میں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ﴿وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً ؕ وَ كَانَ تَقِيًّا ۙ﴾ (19/مریم:13) ''اور خاص اپنے پاس سے رقت قلب اور پاکیزگی اور وہ بڑے پرہیزگار تھے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ (3) عام صدقہ کے لیے مثلاً: ﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝﴾ (30/الروم:39) ''اور تم جو صدقہ دو گے جسے اللہ کی رضا طلب کرتے ہو گے تو ایسے ہی لوگ عنقریب بڑھاتے رہیں گے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت کے تحت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''زکوٰۃ سے یہاں اصطلاحی زکوٰۃ مراد نہیں۔ شریعت کی یہ اصطلاح تو بہت بعد کی ہے بلکہ مطلق صدقہ مراد ہے، جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے دیا جائے۔''

(تفعّل) تَزَكٍّ پاکیزگی حاصل کرنا۔ پاک ہونا۔ ﴿وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ﴾ (35/فاطر:18) ''اور جس نے پاکیزگی حاصل کی تو وہ تو بس پاکیزگی حاصل کرتا ہے اپنے ہی لیے۔'' ﴿وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ﴾ (80/عبس:7) ''آپؐ پر ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ پاکیزگی حاصل نہیں کرتا۔'' ''ابن زیدؒ کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی تزکیؒ کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس سے مراد اسلام قبول کرنا ہی ہے۔ چنانچہ وہ مثال میں قرآن مجید کی حسبِ ذیل تین آیات کو پیش کرتے ہیں: ﴿وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ۝﴾ (20/طٰہٰ:76) ''اور یہ جزا ہے اس کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔'' یعنی اسلام لے آئے۔ ﴿وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۙ﴾ (80/عبس:3) اور ''تمہیں کیا خبر شاید کہ وہ پاکیزگی اختیار کرے۔'' یعنی مسلمان ہو جائے۔ ﴿وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ﴾ (80/عبس:7) ''اور تم پر کیا ذمہ داری ہے اگر وہ پاکیزگی اختیار نہ کرے۔'' یعنی مسلمان نہ ہو۔ (ابن جریرؒ بحوالہ تفہیم القرآن، ج۶ ص ۲۴۲) نوٹ: يَزَّكّٰى اصل میں يَتَزَكّٰى ہے۔

ر	ك	ع

(ف) رَكْعًا، رُكُوْعًا عاجزی کے اظہار میں جھکنا۔ پشت میں خم ڈالنا۔ اصطلاحاً رکوع نماز کا ایک رکن ہے۔ لغوی معنی جھکنے کے اعتبار سے عربی زبان میں رکوع، سجود یعنی سجدہ کرنا کے معنوں میں بھی اکثر استعمال ہوتا ہے جیسے اس شعر میں ہے (فَخَرَّ عَلٰى وَجْهِهٖ

رَاکِعًا ـــــــ وَتَابَ اِلَی اللّٰہِ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ)۔یعنی وہ سجدہ کرتے ہوئے منہ کے بل گر پڑا اور بارگاہِ الٰہی میں ہر گناہ سے توبہ کی۔اس شعر میں رَاکِعًا کا معنی سَاجِدًا (سجدہ کرنے والا) ہے۔(روح المعانی بحوالہ ضیاء القرآن)۔حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''رکوع کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں، اور اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ سجدہ پر بھی بولا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ بھی جھکنے کا انتہائی درجہ ہے، مگر اصطلاحِ شرع میں اس خاص جھکنے کو رکوع کہتے ہیں جو نماز میں معروف و مشہور ہے۔'' (معارف القرآن، ج۱،ص ۲۱۵)۔﴿ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ ارْکَعُوْا لَا یَرْکَعُوْنَ ﴾(77/المرسلٰت:48)''اور جب بھی کہا جاتا ہے ان لوگوں سے کہ تم لوگ رکوع کرو یعنی نماز پڑھو تو وہ لوگ رکوع نہیں کرتے ہیں یعنی نماز نہیں پڑھتے۔''

اِرْکَعْ ج:اِرْکَعُوْا۔فعل امر ہے۔تو رکوع کر۔اوپر آیت نمبر(77/المرسلٰت:48)دیکھیں۔

رَاکِعٌ ج: رَاکِعُوْنَ اور رُکَّعٌ۔اسم الفاعل ہے۔جھکنے والا۔عاجزی کرنے والا۔رکوع کرنے والا۔﴿ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّہٗ وَ خَرَّ رَاکِعًا وَّ اَنَابَ ﴾(38/صٓ:24)''سو وہ معافی مانگنے لگ گئے اپنے رب سے اور گر پڑے رکوع میں اور (دل و جان سے) اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔اس آیت میں بھی صاحبؒ ضیاء القرآن کے مطابق رَاکِعٌ سے مراد سَاجِدٌ ہے۔﴿ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ﴾ (3/آل عمران:43)''اور آپ (اے مریم) رکوع کریں رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔''﴿ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَ الْعٰکِفِیْنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ﴾(2/البقرۃ:125)''کہ تم دونوں پاک رکھو میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں کے لیے۔''

ترکیب

'وَ' حرف عطف ہے اور اَقِیْمُوا گزشتہ آیت میں لَا تَلْبِسُوا پر عطف ہے۔ اَقِیْمُوا فعل امر میں جمع مذکر کا صیغہ ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر ہے۔اَلصَّلٰوۃَ اس کا مفعول ہے۔آگے وَاٰتُوا میں 'وَ' عطف کا ہے اور اٰتُوا بھی فعل امر ہے اور اَلزَّکٰوۃَ اس کا مفعول ہے۔وَارْکَعُوْا میں 'وَ' عطف کا ہے اور اِرْکَعُوْا بھی فعل امر ہے۔مَعَ ظرف ہے اور مضاف ہے اور متعلق ہے اِرْکَعُوْا سے، اَلرّٰکِعِیْنَ مضاف الیہ ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:43

وَ اَقِیْمُوا	الصَّلٰوۃَ	وَاٰتُوا	الزَّکٰوۃَ	وَارْکَعُوْا
اور تم لوگ قائم کرو	نماز کو	اور تم لوگ ادا کرو	زکوٰۃ	اور تم لوگ جھکو

مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ﴿۴۳﴾
(نماز میں) جھکنے والوں کے ساتھ

نوٹ:1 آیت مبارکہ میں بنی اسرائیل سے جو یہ فرمایا وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ تو اس سے کیا مراد ہے۔حضرت مفتی محمد شفیعؒ اس کا جواب دیتے ہیں''یہاں نماز کا ایک جزبول کر کُل نماز مراد لی گئی ہے، جیسے قرآن مجید میں ایک جگہ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ فرما کر پوری نماز فجر مراد ہے اور بعض روایات حدیث میں سجدہ کا لفظ بول کر پوری رکعت یا نماز مراد لی گئی ہے، اس لیے مراد آیت کی یہ ہوگئی کہ نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے ساتھ۔''لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ نماز کے بہت سے ارکان میں سے خاص رکوع کا ہی کیوں ذکر کیا گیا تو اس کا جواب حضرت مفتی محمد شفیعؒ اِن الفاظ میں دیتے ہیں''یہود کی نماز میں سجدہ وغیرہ تو تھا، مگر رکوع نہیں تھا، رکوع اسلامی نماز کی خصوصیات میں سے ہے، اس لیے راکعین کے لفظ سے امت محمدیہؐ کے نمازی مراد ہوں گے، جن کی نماز میں رکوع بھی ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم بھی امت محمدیہؐ کے نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو، یعنی اوّل ایمان قبول کرو پھر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرو۔'' (معارف القرآن، ج۱،ص ۲۱۵)۔

نوٹ :2 ہمارے بزرگوں میں ایک بحث ہوئی ہے کہ کیا کافروں کو شریعت کے فروعی احکامات کا مخاطب بنانا درست ہے۔تو اس کا جواب جمہور علماء نے یہ دیا ہے کہ آیت مبارکہ کے یہ سارے احکام ایک آیت قبل کے حکم اِیمان وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ کے ماتحت ہیں۔یعنی پہلے ایمان لاؤ اور پھر ان احکامات پر عمل کرو۔'' (بحوالہ تفسیر ماجدیؒ۔تلخیصاً)۔

آیت:44

﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ ﴾

تَاْمُرُوْنَ (ء م ر): البقرۃ آیت 27 دیکھیں۔ اَلنَّاسُ: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

ب ر ر

(س۔ض) **بِرًّا** احسان وحسنِ سلوک کرنا۔نیکی وبھلائی کرنا۔کسی کے حق کو پورا کرنا، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہو، ماں باپ کا حق ہو یا عام بندوں کا حق ہو۔اِن بنیادی حقوق کے علاوہ اس لفظ میں ان حقوق کو پورا کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے ہے جو معاہدات، قول وقرار اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔﴿ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ ﴾(60/الممتحنۃ:8)''جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمہیں جلا وطن نہیں کیا ان کے ساتھ حسن سلوک واحسان کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا۔''

بِرٌّ اسم ذات بھی ہے۔نیکی۔اس میں اعتقادی اور عملی دونوں قسم کی نیکیاں شامل ہیں اور قرآن مجید میں سورہ البقرہ کی آیت 177 میں اس کی تفصیل ہے ﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ﴾(2/البقرۃ:177)''نیکی (بس یہی) نہیں کہ تم پھیر لو اپنے رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف۔'' حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:''بِرٌّ کے معنیٰ لغت عربی میں بہت وسیع ہیں، نیکی کے جملہ اقسام پر شامل ہے۔اُردو میں اس کا صحیح مفہوم لفظ طاعت ہی سے ادا ہوسکتا ہے۔اہل لغت ہی کو نہیں اہل تفسیر کو بھی بِرٌّ کے مفہوم کی بھی وسعت مسلم ہے۔ اَلْبِرُّ اِسْمٌ جَامِعٌ لِّلطَّاعَاتِ وَاَعْمَالِ الْخَيْرِ الْمُقَرِّبَةِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى۔ (کبیر) (تفسیر ماجدیؒ،ص ۸۴)۔مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں:''یہ لفظ احسان اور نیکی کی تمام قسموں پر بھی حاوی ہے اور عدل کا بھی ہم معنی ہے۔اپنے استعمالات کے لحاظ سے یہ لفظ اثم (حق تلفی) عقوق (والدین کی نافرمانی) غدر (بے وفائی) اور ظلم کا ضد ہے۔'' (تدبر قرآن، ج۱،ص ۱۸۷)۔حدیث میں ہے: حج مبرور کی جزاء جنت کے سوا کچھ نہیں۔اس میں حج مبرور سے مراد بِرٌّ یعنی نیکیوں سے بھرپور حج ہے۔

بَارٌّ ج:اَبْرَارٌ۔اسم الفاعل ہے۔نیکی کرنے والا۔بطور صفت بھی استعمال ہوتا ہے بمعنی نیک۔شریعت کی رو سے بَارٌّ وہ ہے جو اپنے ذمے عائد ہونے والے حقوق کو پوری طرح ادا کرے، اپنے رب کی اطاعت کرے اور اس کے منع کیے ہوئے افعال سے پرہیز کرے۔﴿ وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ ﴾(3/آل عمران:193)''اور تو موت دے ہم کو نیکی کرنے والوں یعنی نیک لوگوں کے ساتھ۔''

بَرَّةٌ ج:بَرَرَةٌ۔فَاعِلٌ کے وزن پر بَارِرٌ تھا۔الف گر گیا تو بَرِرٌ ہوا پھر ادغام ہو کر بَرٌّ بنا۔اسم صفت ہے۔اس کی نسبت اللہ

تعالیٰ اور بندے دونوں کی طرف ہوتی ہے۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتو مطلب ہوتا ہے احسان کرنے والا۔﴿ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴾(52/الطور:28)''یقیناً وہی احسان کرنے والا ہر حال میں رحم کرنے والا ہے۔''اور جب اس کی نسبت بندے کی طرف ہوتو معنی ہوتے ہیں حسنِ سلوک کرنے والا۔اطاعت گزار۔فرمانبردار۔نیک۔﴿ وَ كَانَ تَقِيًّا ۙ وَّ بَرًّاۢ بِوَالِدَيْهِ ﴾(19/مریم:13-14)''اور وہ یعنی یحییٰ تقوے والے تھے اور نیکی کرنے والے تھے اپنے والدین کے ساتھ۔''اس کی جمع قرآن مجید میں ایک ہی دفعہ فرشتوں کی صفت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔﴿ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴾(80/عبس:16)''جو بڑے درجہ والے نیک کار ہیں۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔صاحبؒ لغات القرآن بَرَرَةٌ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:''بَرَرَةٌ، اَبْرَارٌ کی بہ نسبت زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اَبْرَارٌ بَارٌّ کی جمع ہے اور بَرَرَةٌ بَرٌّ کی اور جس طرح عَدْلٌ (یعنی سرتاپا انصاف) عَادِلٌ سے زیادہ بلیغ ہے اسی طرح بَرٌّ، بَارٌّ سے زیادہ بلیغ ہے۔''(لغات القرآن، ج ۲ ص ۲۷)

بَرٌّ صفت کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔خشکی۔(جس طرح حسنِ سلوک کرنے والا اپنے اندر سکون اور ٹھہراؤ محسوس کرتا ہے اسی طرح پانی پر ہچکولوں کے مقابلے میں خشکی پر انسان کو سکون اور ٹھہراؤ ملتا ہے)۔﴿ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ﴾(6/الانعام:59)''اور وہ جانتا ہے جو خشکی اور تری میں ہے۔''

ن س ی

(س) نَسْيًا اور نِسْيَانًا نسیان کا معنی ہے انسان کا اس چیز کو محفوظ نہ رکھنا جو اسے ودیعت کی گئی۔اس کی وجہ کبھی دل کی کمزوری اور غفلت ہوتی ہے اور کبھی قصداً بھی انسان کسی چیز کو اپنے دل سے مٹا دیتا ہے۔چنانچہ یہ لفظ کسی بات یا چیز کو بلا ارادہ بھلا دینا یا ارادۃً بھلا دینا، دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔﴿ وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴾(20/طٰہٰ:115)''اور ہم نے حکم دیا تھا آدمؑ کو اس سے پہلے (کہ وہ اُس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اُس کا کوئی قصد۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ﴾(87/الاعلیٰ:6)''ہم پڑھائیں گے آپؐ کو تو آپؐ نہیں بھولیں گے۔''﴿ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ﴾(32/السجدۃ:14)''پس اب چکھو سزا اُس جرم کی کہ تم نے بھلا دیا تھا اپنے اس روز کی ملاقات کو۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔﴿ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ﴾(5/المائدۃ:13)''اور اُنہوں نے بھلا دیا بڑا حصہ جس کے ساتھ اُنہیں نصیحت کی گئی تھی۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔ہر وہ نسیان جو قصد و ارادہ سے ہو، قابل مذمت ہے اور جو بغیر قصد اور ارادہ سے ہو وہ معاف ہے۔اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا رُفِعَ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ۔اٹھا لیا گیا (یعنی معاف کر دیا گیا) میری امت سے خطاء اور نسیان کو۔''نسیان کا لفظ جان بوجھ کر کسی چیز کو چھوڑ دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً:﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ ﴾(7/الاعراف:165)''پھر جب اُنہوں نے فراموش کر دی جو اُنہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے نجات دے دی اُنہیں جو روکتے تھے برائی سے۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:''نسیان جان بوجھ کر کسی چیز کو چھوڑ دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔''(ضیاء القرآن، ج ۲، ص ۹۷)۔قرآن مجید کی کئی آیات میں نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی گئی ہے مثلاً:﴿ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ﴾(7/الاعراف:51)''سو آج ہم فراموش کر دیں گے اُنہیں جیسے انہوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا۔''﴿ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ﴾

(9/التوبۃ:67) ''انہوں نے بھلا دیا اللہ کو تو اس (اللہ) نے بھی انہیں فراموش کر دیا۔'' اور ﴿اِنَّا نَسِیۡنٰکُمۡ﴾ (32/السجدۃ:14) ''ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا۔'' ایسی تمام آیات جہاں نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے وہاں اس کے معنی ترک کرنے اور نظر انداز کرنے کے ہوتے ہیں کیونکہ بھولنا ایک انسانی عیب ہے اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ چنانچہ الاعراف:51 کے تحت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''انساء الٰہی سے جو ظاہر ہے کہ بالکل ارادی اختیاری ہوگا۔ مراد اللہ کا ان لوگوں کو رحمت کے ساتھ یاد نہ فرمانا ہے۔ محاورۂ عرب میں نسیان و انساء کا یہ استعمال نامعلوم نہیں۔'' اور اسی آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''نسیان (بھلا دینے) کا کیا معنی ہے؟ امام رازیؒ نے دو قول نقل کیے ہیں۔ (۱) نسی بمعنی ترک یعنی ہم انہیں چھوڑ دیں گے اور ان کو نجات نہیں دیں گے۔ (۲) دوسرا معنی یہ ہے کہ ہم ان سے ایسا برتاؤ کریں گے جیسے ہم نے ان کو فراموش کر دیا ہے۔'' اور پیر کرم شاہ صاحبؒ السجدہ:14 کے تحت فرماتے ہیں: ''نسیان کا معنی بھلا دینا اور فراموش کر دینا ہے لیکن کسی چیز کو ترک کرنے اور نظر انداز کر دینے کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے خصوصاً جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو کیونکہ وہاں بھولنا اور فراموش کرنا مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ عیب ہے اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے وہاں فقط ترک کرنا، نظر انداز کرنا کے معنی میں یہ لفظ مستعمل ہوگا علامہ ابن منظور لکھتے ہیں: قولہٗ عزوجل۔ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّمَا مَعْنَاهُ تَرَكُوا اللّٰهَ فَتَرَكَهُمْ۔'' (لسان العرب بحوالہ ضیاء القرآن، ج ۳، ص ۶۳۴)

لَا تَنْسَ — فعل نہی ہے۔ تو مت بھول یا مت بھلا۔ ﴿وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ (28/القصص:77) ''اور تو مت بھول اپنے حصے کو دنیا میں سے۔''

نَسْیٌ — اسم ذات ہے۔ وہ معمولی چیز جو توجہ کے قابل نہ ہو۔ ﴿وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝﴾ (19/مریم:23) ''اور میں ہوتی ایک معمولی چیز بھولی ہوئی۔'' اس آیت میں نَسْیٌ کے متعلق امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''نَسْیٌ کے معنی ہیں وہ حقیر چیز جس کی طرف کوئی دھیان نہ دے اگرچہ وہ بھولی ہوئی نہ ہو پھر بھولی ہوئی چیز کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے مَنْسِیًّا کا لفظ لایا گیا۔'' (تلخیصاً)

مَنْسِیٌّ — مَفْعِیٌّ کے وزن پر اسم المفعول ہے۔ وہ چیز جس کو بھلا دیا جائے۔ فراموش شدہ چیز۔ بھولی ہوئی چیز۔ اوپر (19/مریم:23) دیکھیں۔

نَسِیٌّ — فَعِیْلٌ کے وزن پر فاعل کے معنی میں ہے۔ بھولنے والا۔ ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝﴾ (19/مریم:64) ''اور نہیں ہے آپؐ کا رب بھولنے والا۔''

(افعال) اِنْسَاءً — کسی دوسرے کو کوئی چیز یا بات بھلا دینا۔ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ (59/الحشر:19) ''اور تم لوگ مت ہو ان لوگوں کی مانند جو بھولے اللہ کو تو اس نے یعنی اللہ نے ان کو بھلا دیا اپنا آپ۔'' ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا﴾ (2/البقرۃ:106) ''جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا ہم بھلا دیتے ہیں۔''

اَنْفُسٌ (ن ف س): البقرۃ آیت 9 دیکھیں۔

ت ل و

(ن) تَلْوًا — کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ پیروی کرنا۔ اتباع کرنا۔ اصل میں تَلَا یَتْلُوْ کا مطلب پیروی کرنا ہے۔ یہ پیروی کبھی ظاہری

اور جسمانی طور پر کسی کے پیچھے پیچھے چلنے سے ہوتی ہے اور کبھی کسی چیز کو پڑھنے اور اس کے معنی میں غور وفکر کر کے جو راستہ سمجھ آئے اس پر چلنے سے ہوتی ہے۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مصدر تَلْوٌ اور تُلُوٌّ استعمال ہوتا ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے تِلَاوَۃٌ مصدر استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں تِلْوٌ اونٹنی کے اس بچے کو کہتے ہیں جس کا دودھ چھڑا دیا جائے اور وہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلے۔ (مصباح) ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا﴾ (91/الشمس:2) ''قسم ہے چاند کی جب وہ پیچھے پیچھے چلا اس (سورج) کے۔''

تِلَاوَۃً کسی چیز کو پڑھنا اور اس کی پیروی کرنا۔ تلاوت کا لفظ، قرأت (پڑھنا) سے خاص ہے۔ قرأت کا لفظ پڑھنے اور مطالعہ کرنے کے لیے عام ہے خواہ کوئی تحریر پڑھی جائے، کوئی کتاب یا ایک آدھ لفظ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو کچھ قرأت کی جائے اس کی پیروی بھی لازماً کی جائے جبکہ تلاوت میں یہ مفہوم ہے کہ جو کچھ پڑھا جائے اس کی پیروی بھی کی جائے۔ چنانچہ تلاوت کے اندر قرأت کا مفہوم ہے لیکن قرأت کے اندر تلاوت کا مفہوم نہیں ہے۔ اسی لیے عربی زبان میں کسی کے خط کو پڑھنے کے لیے تَلَوْتُ رُقْعَتَكَ کے الفاظ نہیں بولے جاتے۔ اصطلاحاً تلاوت کا لفظ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں کو پڑھنے کے لیے مخصوص ہے کیونکہ ان کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان میں درج شدہ ہدایات کی پیروی کرنا بھی لازم ہوتا ہے۔ اب چونکہ قرآن مجید واحد آسمانی کتاب ہے جو اپنی اصلی حالت میں ہے اس لیے تلاوت کا لفظ قرآن پاک کو پڑھنے کے لیے مخصوص ہے۔ اس لیے جب ''تلاوت قرآنِ پاک'' کہا جائے تو اس میں دو مفہوم ہیں ایک قرآنِ پاک کو پڑھنا اور دوسرا اس پر عمل کرنا۔ تَلَا يَتْلُوْ کے بعد اگر مفعول بنفسہٖ آئے تو مطلب ہوتا ہے پڑھنا یعنی تلاوت کرنا۔ اور اگر عَلٰی کا صلہ آئے تو مطلب ہوتا ہے کسی کو پڑھ کر سنانا۔ ﴿وَ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ ۖ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ﴾ (2/البقرۃ:113) ''اور کہا نصاریٰ نے کہ نہیں ہیں یہود کسی چیز پر حالانکہ وہ لوگ پڑھتے ہیں کتاب کو۔'' ﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ﴾ (39/الزمر:71) ''کیا نہیں پہنچے تم لوگوں کے پاس کچھ رسول تم میں سے، وہ لوگ پڑھ کر سناتے تھے تم کو تمہارے رب کی آیات۔'' ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ﴾ (2/البقرۃ:121) ''وہ لوگ جن کو ہم نے دی کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جیسے کہ اُس کو پڑھنے کا حق ہے۔'' امام راغبؒ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں: ''کہ وہ اس کو پڑھ کر سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔'' اور قرآن مجید میں یہ جو فرمایا ﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ﴾ (2/البقرۃ:102) جس میں تلاوت کی نسبت شیاطین کی طرف کی گئی ہے تو ہمارے بزرگوں نے اس کی تین طرح سے وضاحت کی ہے (1) اگر تَتْلُوْا، تِلَاوَۃٌ سے مشتق ہے تو پھر آیت کے معنی ہوں گے ''اور انہوں نے پیروی کی اس کی جس کو شیاطین پڑھا کرتے تھے۔'' (عام طور پر اسی طرح ترجمہ کیا گیا ہے) اس صورت میں شیاطین کے پڑھنے کو تلاوت کہا گیا تو اس کی وجہ امام راغبؒ کے نزدیک یہ ہے کہ ان شیاطین کو یہ گمان باطل اور زعم تھا کہ وہ کتب الٰہیہ کی تلاوت کر رہے ہیں۔ (2) اگر تَتْلُوْا، تَلُوٌّ یا تُلُوٌّ سے مشتق ہو تو پھر آیت کے معنی ہوں گے ''اور انہوں نے پیروی کی اس چیز کی جس کی پیروی کی شیاطین نے۔'' لیکن آیت کا یہ ترجمہ میرے علم کی حد تک نہیں کیا گیا۔ (3) ایک تیسری وجہ جو صاحبؒ ضیاء القرآن نے لکھی ہے وہ یہ کہ تَلُوٌّ کا ایک معنی بہتان باندھنا بھی ہے اس صورت میں آیت کا مفہوم ہوگا کہ یہودی پیروی کرنے لگے اس چیز (سحر) کی جس کا شیطان حضرت سلیمانؑ پر بہتان باندھا کرتے تھے۔ (واللہ اعلم)۔ امام راغبؒ کے مطابق تلاوت کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی نازل کرنے کے ہوتے ہیں جیسے فرمایا: ﴿ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ

وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾ (3/آل عمران:58) ''یہ جسے ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں نشانیوں میں سے ہے اور پُرحکمت مضمون میں سے۔'' تو اس آیت میں نَتْلُوْهُ کے معنی نازل کرنا کے ہیں۔

اُتْلُ فعل امر ہے۔ تو پڑھ کر سنا۔ ﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ (29/العنکبوت:45) ''آپؐ پڑھئے جو وحی کیا گیا آپؐ کی طرف کتاب میں سے۔'' ﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ﴾ (10/یونس:71) ''پڑھ کر سناؤ ان لوگوں کو نوحؑ کی خبر۔''

تَالٍ اسم الفاعل ہے۔ واحد مذکر۔ تلاوت کرنے والا (تِلَاوَةٌ سے)

تَالِيَةٌ ج: تَالِيَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مؤنث۔ تلاوت کرنے والی (تِلَاوَةٌ سے)۔ ﴿فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ﴿۳﴾﴾ (37/الصافات:3) ''پھر ذکر کی تلاوت کرنے والے (فرشتوں کی)۔''

اَلْكِتَابُ (ك ت ب): البقرۃ آیت 2 دیکھیں۔

ع ق ل

(ض) عَقْلًا عربی زبان کا یہ لفظ کئی معنی کا مجموعہ ہے۔ مثلاً روکنا۔ منع کرنا۔ کسی شے پر غور و فکر کر کے اس کی حقیقت کو سمجھ لینا۔ دانا ہونا۔ دانائی کی صلاحیت کو استعمال کرنا۔ غلطی کا احساس کرنے کے قابل ہونا۔ عربی میں عِقَالٌ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کا پاؤں باندھ دیا جائے اور جس سے اونٹ آزادی سے چل پھر نہ سکے۔ سر پر باندھنے کی رسی کو بھی عِقَالٌ کہا جاتا ہے۔ عورت جب اپنے بال باندھ لے تو کہتے ہیں عَقَلَتِ الْمَرْءَةُ شَعْرَهَا۔ اسی طرح عَقَلَ لِسَانَهٗ کا معنی ہے اس نے اپنی زبان روک لی۔ قرآن مجید میں اس مادے سے ماضی اور مضارع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اور اکثر ان کا ترجمہ ''عقل'' سے کیا گیا ہے۔ عقل بطور اسم ذات قرآنِ مجید میں استعمال نہیں ہوا۔ ﴿يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ﴾ (2/البقرۃ:75) ''وہ لوگ سنتے ہیں اللہ کے کلام کو پھر وہ بدل دیتے ہیں اس کو اس کے بعد کہ جو انہوں نے سمجھا اس کو۔'' ﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾﴾ (2/البقرۃ:73) ''اس طرح اللہ زندہ کرے گا مردہ کو اور وہ دکھاتا ہے تم لوگوں کو اپنی نشانیاں شاید تم لوگ عقل سے کام لو۔'' اصل میں عقل وہ روحانی نور (یاقوت) ہے جس سے چیزوں کی حقیقت کو سمجھا جاتا ہے، جس سے نقصان دہ چیزوں سے بچا جاتا ہے، جس سے انسان نفع اور نقصان کا فرق کرتا ہے، جو انسان کو فائدہ مند چیزوں کے حصول اور قبول علم کے لیے ہر وقت تیار رکھتا ہے اور جس سے انسان سوچ و بچار کرتا ہے۔ عقل کو عقل بھی اس لیے کہتے ہیں کہ عقل کے معنی منع کرنے کے ہیں چونکہ عقل عاقل کو نازیبا باتوں سے روکتی رہتی ہے، اس لیے اس کا نام ''عقل'' ہوا۔ اس روکنے کے مفہوم کے لحاظ سے اسے نُهْيَةٌ بھی کہتے ہیں (یعنی بری باتوں سے روکنے والی عقل)۔ اس کی جمع قرآن مجید میں استعمال ہوئی ہے لِاُولِي النُّهٰى (طٰہٰ:54)۔ یا عقل مَعْقِلٌ سے ماخوذ ہے، معقل کہتے ہیں جائے پناہ کو، اور چونکہ عقلمند کو عقل کے تلے ہی پناہ ملتی ہے اس لیے اس کو عقل کہنے لگے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل کا محل قلب ہے چنانچہ فرمایا: ﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ﴾ (22/الحج:46) ''کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے؟'' عقل کی قسموں

کے متعلق حضرت علیؓ کا قول ہے: اَلْعَقْلُ عَقْلَانِ۔ مَطْبُوْعٌ وَمَسْمُوْعٌ۔ عقل کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو طبیعت میں ودیعت کی جاتی ہے اور دوسری وہ جو سن کر حاصل ہوتی ہے۔ وَلَا یَنْفَعُ مَسْمُوْعٌ اِذَا لَمْ یَكُ مَطْبُوْعٌ اور وہ عقل جو سن کر حاصل ہوتی ہے وہ فائدہ مند نہیں ہوتی جب تک طبیعت میں ودیعت کی جانے والی عقل موجود نہ ہو۔ كَمَا لَا یَنْفَعُ ضَوْءُ الشَّمْسِ وَضَوْءُ الْعَیْنِ مَمْنُوْعٌ جس طرح سورج کی روشنی اس وقت فائدہ نہیں دیتی جب آنکھ میں روشنی نہ ہو۔ عقل کے پہلے معنی کی طرف آنحضرتؐ نے ایک حدیث میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: مَا خَلَقَ اللّٰهُ خَلْقًا اَكْرَمَ عَلَیْهِ مِنَ الْعَقْلِ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کے نزدیک عقل سے زیادہ باعزت ہو۔ اور دوسرے معنی کی طرف آنحضرتؐ کے اس ارشاد میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ مَا كَسَبَ اَحَدٌ شَیْئًا اَفْضَلَ مِنْ عَقْلٍ یَّهْدِیْهِ اِلٰی هُدًی اَوْ یَرُدُّهٗ عَنْ رَدًی کہ کسی شخص نے اس عقل سے بڑھ کر کوئی چیز حاصل نہیں کی جو انسان کی رہنمائی کرے یا اسے ہلاکت سے بچائے چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَ مَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾ (29/العنکبوت:43) ''اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔'' میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ اور ہر وہ جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے فقدان عقل کی وجہ سے کفار کی مذمت فرمائی ہے وہاں دوسرے معنی ہی مراد ہیں جیسے فرمایا: ﴿وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴾ (2/البقرۃ:171) ''جو کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے، بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔'' (تلخیص از مفردات القرآن، مترادفات القرآن، لغات القرآن، مصباح اللغات)

ترکیب اَ استفہامیہ ہے اور اظہار حیرت اور ملامت کے لیے ہے۔ تَاْمُرُوْنَ فعل ہے اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر اس کا فاعل ہے۔ اَلنَّاسَ مفعول ہے اور بِالْبِرِّ متعلق فعل ہے۔ یہاں یہ بھی نوٹ کریں کہ جس کو حکم دیا جائے وہ مفعول بنفسہٖ آتا ہے اور جو حکم دیا جائے اس کے ساتھ زیادہ تر 'ب' یا 'اَنْ' کا صلہ آتا ہے۔ 'وَ' عطف کا ہے تَنْسَوْنَ، تَاْمُرُوْنَ پر عطف ہے اور اَنْفُسَكُمْ اس کا مفعول ہے۔ آگے 'وَ' حالیہ ہے۔ اَنْتُمْ مبتدا اور جملہ فعلیہ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اس کی خبر ہے یہ جملہ اسمیہ حال ہے تَنْسَوْنَ کی ضمیر فاعلی کا۔ آگے اَ استفہامیہ ہے، 'فَ' حرف عطف ہے، لَا نافیہ ہے اور تَعْقِلُوْنَ فعل اور اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر اس کا فاعل ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ
البقرۃ:44

اَتَاْمُرُوْنَ	النَّاسَ	بِالْبِرِّ	وَتَنْسَوْنَ
کیا تم حکم دیتے ہو	لوگوں کو	نیکی کا	اور تم بھول جاتے ہو

اَنْفُسَكُمْ	وَ	اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ	الْكِتٰبَ
اپنے آپ کو	حالانکہ	تم پڑھتے ہو	کتاب

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ
تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے

نوٹ اس آیت مبارکہ کی تفسیر اگر معارف القرآن سے دیکھ لی جائے تو بہت فائدہ ہوگا۔ بہر حال حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''آیت کا مطلب یہ نہیں کہ بے عمل آدمی کو وعظ کہنا جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہیے۔'' (معارف القرآن، ج ۱ ص: ۲۱۸)

آیت: 45

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝۴۵﴾

اِسْتَعِیْنُوْا (ع و ن): الفاتحہ آیت 4 دیکھیں۔

ص ب ر

(ض) **صَبْرًا** صَبْرٌ کے لغوی معنی ہیں روکنا اور باندھنا۔ عربی میں صَبَرْتُ الدَّابَّۃَ کے معنی ہیں میں نے جانور کو کھانا کھلائے بغیر باندھ دیا۔ اسی طرح صَبَرْتُ نَفْسِیْ عَنْ کَذَا کے معنی ہیں میں نے اپنے آپ کو فلاں چیز سے روک دیا۔ اس لغوی مفہوم کے ساتھ یہ لفظ جب قرآن وسنت میں استعمال ہو تو پھر اس کے معنی ہوتے ہیں مشکل اور ناموافق حالات میں عقل اور شریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضے کے مطابق اپنے آپ کو روکے رکھنا، مشکلات اور تکلیفوں کو برداشت کرنا، ان کو سہنا، ثابت قدمی سے اپنے کام پر لگے رہنا اور اپنے موقف پر ڈٹے رہنا۔ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (46/الاحقاف:35) ''تو آپؐ ثابت قدم رہیں جیسے کہ ثابت قدم رہے ہمت والے رسول۔'' ﴿وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ﴾ (25/الفرقان:20) ''اور ہم نے تم میں سے ہر ایک کو دوسرے کی آزمائش کا ذریعہ بنا دیا۔ کیا تم صبر کرو گے۔'' (نوٹ: صبر کی مزید تفصیل آگے نوٹ 1 میں دیکھیں)۔

اِصْبِرْ ج: اِصْبِرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو ثابت قدم رہ۔ تو برداشت کر۔ اوپر آیت نمبر (46/الاحقاف:35) دیکھیں۔ ﴿فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ﴾ (7/الاعراف:87) ''تو تم صبر کرو جب تک اللہ فیصلہ کرے ہمارے درمیان۔''

صَابِرٌ ج: صَابِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ ثابت قدم رہنے والا۔ برداشت کرنے والا۔ ﴿قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ صَابِرًا﴾ (18/الکہف:69) ''حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے۔'' ﴿اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ﴾ (8/الانفال:65) ''اگر ہوں تم میں بیس ثابت قدم رہنے والے، تو وہ لوگ غالب ہوں گے دو سو پر۔'' ﴿قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۰۲﴾ (37/الصافات:102) ''بیٹے نے جواب دیا ابا جان آپ کر دیجیے جو آپ کو حکم ہوا ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔''

صَابِرَۃٌ ج: صَابِرَاتٌ۔ صبر کرنے والی۔ ﴿فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ﴾ (8/الانفال:66) ''پس اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں گے تو وہ دو ہزار پر غالب آئیں گے۔'' ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ﴾ (33/الاحزاب:35) ''اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔''

صَبَّارٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ بہت زیادہ ثابت قدم رہنے والا۔ بہت زیادہ جھیلنے اور برداشت کرنے والا۔ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵﴾ (14/ابراہیم:5) ''بیشک اس میں نشانیاں ہیں ہر ایک بہت زیادہ ثابت قدم رہنے والے، شکر گزار کے لیے۔''

صَبْرٌ اسم ذات بھی ہے۔ ثابت قدمی۔ برداشت۔ استقامت۔ استقلال۔﴿ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾ (103/العصر:3) ''اور باہم تاکید کی حق کی اور باہم تاکید کی ثابت قدمی کی۔'' اور آیت زیر مطالعہ۔

مَا اَصْبَرَ صیغۂ تعجب ہے۔﴿ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴾ (2/البقرۃ:175) ''تو وہ کتنے ثابت قدم ہیں آگ پر۔''

(مفاعلہ) مُصَابَرَةً کسی کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنا۔ عام طور پر یہ لفظ دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

صَابِرْ ج: صَابِرُوْا۔ فعل امر ہے۔ ثابت قدمی میں غالب آؤ یا غالب رہو۔﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ﴾ (3/آل عمران:200) ''اے ایمان والو صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلے میں) اور کمر بستہ رہو (خدمت دین کے لیے)۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

(افتعال) اِصْطِبَارًا اہتمام سے ڈٹے رہنا۔ ثابت قدم رہنا۔

اِصْطَبِرْ فعل امر ہے۔ اہتمام سے ڈٹے رہو۔ ثابت قدم رہو۔﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ (20/طٰہٰ:132) ''اور حکم دو اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود ڈٹے رہو اس پر یعنی نماز پر۔''

اَلصَّلٰوةُ (ص ل و): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔ كَبِيْرَةٌ: (ك ب ر) البقرۃ آیت 34 دیکھیں۔ اِلَّا: البقرۃ آیت 34 دیکھیں۔

خ ش ع

(ف) خُشُوْعًا عاجزی کرنا۔ جھک جانا۔ (خشوع اصل میں وہ قلبی سکون اور انکساری ہے جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہو۔ اس سے اطاعت میں آسانی ہو جاتی ہے۔ کبھی اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں جس کو خضوع کہتے ہیں)۔ آنکھوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے آنکھوں کا جھک جانا۔ آواز کے لیے یہ لفظ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے آواز کا آہستہ اور پست ہو جانا۔ زمین کے لیے استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے زمین کا خشک اور بنجر ہو جانا۔ چہرے کے لیے استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے چہرے کا جھک جانا۔ عربی زبان میں اونٹ کا کوہان اگر لاغری کے سبب سے بیٹھ جائے تو اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔﴿ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ (57/الحدید:16) ''کیا وقت نہیں آیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے کہ جھک جائیں ان کے دل اللہ کے ذکر سے۔''﴿ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴾ (20/طٰہٰ:108) ''اور پست ہو جائیں گی آوازیں اللہ کے حضور، پس تو نہیں سنے گا مگر کچھ کھس پھس۔'' (نوٹ: خشوع کی حقیقت آگے نوٹ 2 میں دیکھیں)۔

خَاشِعٌ ج: خَاشِعُوْنَ اور خُشَّعٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ مذکر کا صیغہ۔ جھکنے والا۔ عاجزی کرنے والا۔﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا ﴾ (59/الحشر:21) ''اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ اُس کو دیکھتے کہ وہ جھک جاتا۔''﴿ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴾ (23/المؤمنون:2) ''وہ لوگ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔''﴿ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ ﴾ (54/القمر:7) ''اُن کی آنکھیں جھکی ہوں گی۔''

خَاشِعَةٌ ج: خَاشِعَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ مونث کا صیغہ۔ جھکنے والی۔ عاجزی کرنے والی۔﴿ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ﴾ (79/النّٰزعٰت:9) ''اُن کی آنکھیں (ڈر سے) جھکی ہوں گی۔''﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ﴾ (88/الغاشیۃ:2) ''کتنے ہی چہرے اُس دن (ذلت کی وجہ سے) جھکے ہوں گے۔''﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً ﴾

(41/حٰمٓ السجدۃ:39)''اور اُس کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تو دیکھتا ہے زمین کو کہ وہ خشک اور بنجر ہے۔''
﴿وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ﴾(33/الاحزاب:35)''اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں۔''

ترکیب 'وٗ' عطف کا ہے اور فعل اِسْتَعِيْنُوْا، آیت 43 میں اِرْكَعُوْا پر عطف ہے۔ اِسْتَعِيْنُوْا فعل امر کا صیغہ ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر ہے اور بِالصَّبْرِ متعلق فعل ہے۔ یہاں ایک بات نوٹ کرلیں کہ استعانت کے اَفعال کا مفعول یعنی جس کی مدد طلب کی جائے، وہ بنفسہٖ آتا ہے۔ (جیسے نَسْتَعِيْنُكَ) اور جس چیز کے ذریعے اس کی مدد حاصل کی جائے اس پر بِ کا صلہ آتا ہے۔ اس آیت میں اِسْتَعِيْنُوْا کے ساتھ بِالصَّبْرِ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ اِسْتَعِيْنُوْا کا مفعول محذوف ہے جو کہ اللہ ہے۔ وَالصَّلٰوةِ میں پھر 'وٗ' عطف کا ہے اور اَلصَّلٰوةِ، اَلصَّبْرِ پر عطف ہے اسی لیے حالت جر میں ہے۔ وَاِنَّهَا میں 'وٗ' کو استئنافیہ اور حالیہ دونوں مانا گیا ہے۔ اِنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے۔ اس کا اسم منصوب آتا ہے اسی لیے اس کے ساتھ ضمیر 'ھا' آئی ہے جو کہ اَلصَّلٰوةِ کے لیے ہے۔ لَكَبِيْرَةٌ اس کی خبر ہے جس پر لام تاکید داخل ہے۔ اس لام تاکید کو 'لام مزحلقہ' کہتے ہیں۔ اِلَّا حصر کے لیے ہے اور جار مجرور عَلَى الْخٰشِعِيْنَ متعلق خبر ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:45

وَاسْتَعِيْنُوْا	بِالصَّبْرِ	وَالصَّلٰوةِ ؕ
اور تم مدد لو	صبر سے	اور نماز سے

وَاِنَّهَا	لَكَبِيْرَةٌ	اِلَّا	عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ﴿۴۵﴾
اور یقیناً وہ (نماز)	بھاری ہے	مگر	عاجزی کرنے والوں پر (بھاری نہیں)

نوٹ:1 **صَبْرٌ:** صبر قرآن وسنت کی اہم ترین اصطلاحوں میں سے ایک ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ سورۃ العصر میں نجات کے چار لوازم بیان ہوئے ہیں جن میں سے ایک صبر ہے۔ دنیا کی اقوام میں سے جس کسی پر بھی اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بارش ہوئی وہ اسی صبر کی وجہ سے ہوئی۔ مثلاً فرمایا:﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ﴾(7/الاعراف:137)''اور پورا ہوگیا نیکی کا وعدہ تیرے رب کا بنی اسرائیل پر بسبب ان کے صبر کرنے کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؗ﴾(32/السجدۃ:24)''اور ہم نے ان میں جب کہ انہوں نے صبر کیا پیشوا بنا دیے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اردو زبان میں اس کا ترجمہ لفظ ''صبر'' ہی سے کیا جاتا ہے لیکن اردو میں یہ لفظ بہت محدود معنوں میں استعمال ہوتا ہے عام طور پر اردو زبان میں مجبوری کا نام صبر ہے۔ ظلم کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کا نام صبر ہے۔ کوئی تکلیف اور مصیبت آپڑے تو غم کا اظہار نہ کرنا صبر ہے۔ اسی طرح انگریزی زبان میں بھی کوئی ایک لفظ ایسا نہیں جو صبر کی معنوی وسعت کو بیان کرے۔ البتہ دو لفظوں کو اگر ملا لیا جائے تو صبر کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ وہ دو لفظ ہیں: Patience اور Endurance۔ اردو اور انگریزی کی بنسبت عربی میں اور قرآن و سنت کی اصطلاح میں اس کا معنی بہت وسیع ہے۔ مولانا مودودیؒ صبر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور خواہشات نفس کا وہ انضباط (ضابطہ، ڈھنگ) ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب وضمیر کے پسند کیے ہوئے راستے پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔'' (تفہیم القرآن، ج۱، ص ۷۳)۔ حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''صبر کے لفظی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اصطلاح قرآن وسنت میں نفس کو خلافِ طبع چیزوں پر جمائے رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے۔'' (معارف القرآن، ج۲، ص ۲۷۴)۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں: ''لفظ 'صبر' کے اصل معنی روکنے کے ہیں یعنی نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر اپنے موقف پر جمائے رکھنا۔ قرآن مجید میں اسی حقیقت نے کچھ زیادہ پاکیزہ صورت اختیار کرلی ہے۔ یعنی قرآن میں عموماً اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بندہ پوری طمانیت قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عہد پر ڈٹا رہے اور اس کے وعدوں پر یقین رکھے اور اس راہ میں اس کو جن مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑے ان کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت

نہ دے۔'' (تدبر قرآن، ج۱،ص۱۸۸)۔مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''صبر کے لفظی معنی تنگی اور ناخوشگواری کی حالت میں اپنے کو روکے رہنے کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس کو عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے، اور قدم دائرہ شریعت سے باہر نہ نکالا جائے۔صبر کے یہ معنی نہیں کہ جو امور طبعی اور بشری ہیں، اُن کے آثار کو بھی اپنے اوپر طاری نہ ہونے دیا جائے۔بھوک کے وقت مضمحل اور نڈھال ہو جانا، درد کی تکلیف سے کراہنا، رنج کے وقت آہ سرد بھرنا، عزیزوں قریبوں کی موت پر آنسوؤں سے رونا، ان میں سے کوئی شے بھی صبر کے منافی اور بے صبری میں داخل نہیں۔'' پھر آگے لکھتے ہیں: ''صبر کرنے کے معنی یہ نہیں کہ بندہ بالکل بے حس ہو جائے اور غم کو غم محسوس ہی نہ کرے۔اس کا نام صبر نہیں، بے حسی ہے۔صبر یہ ہے کہ انتہائی غمناک و دردانگیز واقعہ پر بندہ عقل کو نفس پر غالب رکھے، زبان کو شکوہ اور ناشکری سے آلودہ نہ ہونے دے اور نظر مسبب الاسباب پر، اُس کی مصلحت و حکمت پر اُس کی شفقت و رحمت پر رکھے۔

غم میں بھی قانونِ فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں
یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے، دشمن نہیں (اکبرؒ)

(تفسیر ماجدیؒ،ص۷۵۔۷۶)

صاحبؒ تفسیر حقانی فرماتے ہیں:''صبر عقل کا اتباع کر کے نفس کو غضب اور شہوت سے روکنے کو کہتے ہیں اس لیے جس میں یہ دونوں چیزیں ہوں گی، صبر اسی کو نصیب ہوگا۔ملائکہ میں چونکہ غضب اور شہوت نہیں بلکہ صرف عقل ہے تو اس لیے ان کو بھی یہ نعمت نصیب نہیں اور دیگر حیوانات میں عقل نہیں، غضب اور شہوت ہے اسی لیے وہ بھی اس سعادت سے فیضیاب نہیں۔(تفسیر حقانی، ج۱،ص ۵۹۲)۔

صبر کی قسمیں: حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''صبر کی تین قسمیں ہیں اوّل: صبر علی الطاعات، یعنی جن کاموں کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسولؐ نے حکم دیا ہے، ان کی پابندی طبیعت پر کتنی بھی شاق ہو اس پر نفس کو جمائے رکھنا۔دوسرے: صبر عن المعاصی، یعنی جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے منع فرمایا ہے وہ نفس کے لیے کتنی ہی مرغوب ولذیذ ہوں نفس کو اس سے روکنا۔تیسرے: صبر علی المصائب، یعنی مصیبت و تکلیف پر صبر کرنا حد سے زائد پریشان نہ ہونا، اور سب تکلیف و راحت کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر نفس کو بے قابو نہ ہونے دینا۔اسی لیے حدیث میں رسولِ کریمؐ نے فرمایا: اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی، یعنی اصل اور معتبر صبر تو وہی ہے جو ابتداء صدمہ کے وقت اختیار کر لیا جائے۔'' (معارف القرآن، ج۲،ص ۲۷۴ اور ج۵،ص۱۹۱)۔صاحبؒ تفسیر حقانی صبر کی قسموں کے متعلق لکھتے ہیں: واضح ہو کہ صبر کی دو قسمیں ہیں: بدنی اور نفسانی۔پھر بدنی کی بھی دو قسمیں ہیں: فعلی، جیسا کہ بڑے بھاری اور مشقت کے کاموں کو کرنا۔انفعالی، درد اور تکلیف کو برداشت کرنا۔گو اس تکلیف کے آثار خود بخود بشری تقاضوں سے ظاہر ہو جائیں مگر یہ شخص اس حالت میں بھی خلاف قانون عقل و شرع کوئی حرکت نہ کرے اور صبر نفسانی یہ ہے کہ نفس کو اس کی خواہشوں سے روکے۔اگر ناجائز کھانے پینے اور جنسی خواہش کو روکے گا تو اس کو عفت کہیں گے اور اگر فضول چیزوں کی خواہش سے روکے گا تو اس کو زہد و قناعت کہیں گے۔اگر غصہ کی حالت میں اپنے دشمن سے درگزر کرے گا اور نفس کو انتقام لینے سے روکے گا تو اس کو حلم کہیں گے۔اگر کسی کے راز افشاء کرنے سے زبان کو بند کرے گا تو اس کو راز داری کہیں گے اور جو زبان کو بیہودہ بکواس سے اور اپنے اعضاء کو بے جا حرکات سے بند کرے گا تو اس کو متانت کہیں گے۔اسلام نے اس امت کے لیے صبر کی ایک شاخ روزہ کو بھی فرض کر دیا تا کہ نفس کو بھوک اور پیاس کی تکلیف اٹھانے کی عادت پڑے اور جماع جیسی مرغوب چیز کو باوجود سامان مہیا ہونے کے ترک کرنے کا خوگر ہو۔'' (تفسیر حقانی، ج۱،ص ۵۹۲، تلخیصاً)۔چنانچہ حدیث میں روزے کو صبر کہا گیا ہے، فرمایا: صِيَامُ شَهْرِ الصَّبْرِ وَثَلَاثَةِ اَيَّامٍ فِيْ كُلِّ شَهْرٍ يُذْهِبُ وَحُرَ الصَّدْرِ۔ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین روزے سینہ سے بغض کو نکال ڈالتے ہیں۔'' (مفردات القرآن، ج۲،ص ۵۶۷)۔

صبر کا اجر: صبر کا اجر بے حساب ہے۔چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ (39/الزمر:10) ''صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔''

نوٹ 2: خشوع کی حقیقت: حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: خشوع کے معنی ہیں کسی کے سامنے خوف و ہیبت کے ساتھ ساکن اور پست ہونا، چنانچہ ابن عباسؓ نے ''خَاشِعُوْنَ'' کی تفسیر ''خائفون ساکنون'' سے کی ہے۔ اور آیت ''تَرَی الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ط'' بھی دلالت کرتی ہے کہ ''خشوع'' میں ایک طرح کا سکون و تذلل معتبر ہے۔ قرآن کریم میں ''خشوع'' کو وجوہ، ابصار، اصوات وغیرہ کی صفت قرار دیا ہے۔ اور ایک جگہ آیت اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ میں قلب کی صفت بتلائی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اصل خشوع قلب کا ہے اور اعضائے بدن کا خشوع اس کے تابع ہے۔'' (تفسیر عثمانی، ص ۴۵۵) ۔حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''قرآن و سنت میں جہاں خشوع کی ترغیب مذکور ہے اس سے مراد وہ قلبی سکون و انکساری ہے، جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں طاعت آسان ہو جاتی ہے، کبھی اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ وہ باادب، متواضع اور شکستہ قلب نظر آتا ہے، اگر دل میں خوف خدا اور تواضع نہ ہو تو خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی باادب اور متواضع نظر آئے وہ خشوع کا حامل نہیں۔ بلکہ آثار خشوع کا قصداً اظہار کرنا بھی پسندیدہ نہیں، حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر جھکائے بیٹھا ہے، فرمایا: سر اٹھا، خشوع دل میں ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ کا ارشاد ہے کہ ''موٹا پہننے، موٹا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع نہیں، خشوع تو یہ ہے کہ تم حق کے معاملہ میں شریف و رذیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور اللہ نے جو تم پر فرض کیا ہے اُسے ادا کرنے میں اللہ کے لیے قلب کو فارغ کر لو۔'' حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے کہ: حضرت عمرؓ جب بات کرتے تو سنا کر کرتے تھے، جب چلتے تو تیز چلتے، اور جب مارتے تو زور سے مارتے تھے، حالانکہ بلاشبہ وہ خشوع رکھنے والے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنے قصد و اختیار سے خاشعین کی سی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے اور مذموم ہے، ہاں اگر بے اختیار یہ کیفیت ظاہر ہو جائے تو معذور ہے۔ (قرطبیؒ)

فائدہ: خشوع کے ساتھ ایک دوسرا لفظ خضوع بھی استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم میں بھی بار بار آیا ہے، یہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنی ہیں لیکن خشوع کا لفظ اصل کے اعتبار سے آواز اور نگاہ کی پستی اور تذلل کے لیے بولا جاتا ہے، جب کہ وہ مصنوعی نہ ہو بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو، قرآن کریم میں ہے خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ (آوازیں پست ہو گئیں) اور خضوع کا لفظ بدن کی تواضع اور انکساری کے لیے استعمال ہوتا ہے، قرآن حکیم میں ہے: فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِیْنَ (4:26) ''پس اُن کی گردنیں اس کے سامنے جھک گئیں۔'' (معارف القرآن، ج ۱، ص ۲۲۰)

آیت:46

﴿ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ﴾

ظ ن ن

(ن) ظَنًّا علماء لغت فرماتے ہیں کہ ظَنٌّ ان الفاظ میں سے ہے جو مختلف اور متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا لفظی معنی ہے خیال کرنا۔ گمان کرنا۔ پھر کسی کے بارے میں خیال و گمان کرنا کبھی تو یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی شک اور وہم سے آگے نہیں بڑھتا۔ چنانچہ یہ لفظ یقین کرنا اور شک کرنا، دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں کسی چیز کی علامات سے جو نتیجہ حاصل ہو اسے ظَنٌّ کہتے ہیں۔ اگر علامات قوی ہوں تو ظَنٌّ علم اور یقین کے معنی دیتا ہے اور اگر علامات کمزور ہوں تو شک اور وہم کے معنی دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے ماضی، مضارع کے صیغے اور ظَنٌّ بطور اسم ذات اِن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ظَنٌّ کے عام طور پر دو مفعول ہوتے ہیں یعنی کسی کو گمان کیا اور کیا گمان کیا جیسے فرمایا ﴿ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ﴾ (18/الکہف:36) ''اور میں یہ خیال نہیں کرتا کہ قیامت بھی برپا ہو گی۔'' اور کبھی دو مفعولوں کے قائم مقام ایک جملہ آ جاتا ہے۔ ﴿ وَقَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ﴾ (2/البقرۃ:249)

''اور کہا ان لوگوں نے جو خیال کرتے تھے کہ وہ لوگ اللہ سے ملاقات کرنے والے ہیں۔''﴿وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ۝۳۹﴾ (28/القصص:39) ''اور انہوں نے خیال کیا کہ وہ لوگ ہماری طرف نہیں لوٹائے جائیں گے۔'' (ظَنٌّ کی مزید تفصیل آگے نوٹ میں دیکھیں)۔

ظَنٌّ ج: ظُنُوْنٌ۔ اسم ذات بھی ہے۔ خیال۔ گمان۔ ﴿مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ﴾ (4/النساء:157) ''نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی۔'' ﴿وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰﴾ (33/الاحزاب:10) ''اور تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے۔''

ظَانٌّ ج: ظَانُّوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ خیال کرنے والا۔ ﴿الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ﴾ (48/الفتح:6) ''خیال کرنے والے اللہ کے بارے میں برا خیال۔''

مُلٰقُوْنَ (ل ق ی): البقرۃ آیت 14 دیکھیں۔ رَبٌّ (ر ب ب): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔
رٰجِعُوْنَ (ر ج ع): البقرۃ آیت 18 دیکھیں۔

ترکیب یہ پوری آیت گزشتہ آیت میں اَلْخٰشِعِيْنَ کی صفت ہے۔ اَلَّذِيْنَ اسم موصول ہے، يَظُنُّوْنَ فعل اور اس کا فاعل اس میں شامل هُمْ کی ضمیر ہے۔ اگلا جملہ قائم مقام ہے دو مفعولوں کا۔ اس میں اَنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے، هُمْ اس کا اسم اور مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ اس کی خبر۔ مُلٰقُوْا دراصل باب مفاعلہ کے اسم الفاعل مُلَاقٍ کی جمع مُلَاقُوْنَ ہے۔ مضاف ہونے کی وجہ سے نون اعرابی گرا ہوا ہے اور الف کا اضافہ قرآن مجید کا مخصوص املاء ہے۔ رَبِّ اس کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے حالت جرّ میں ہے اور آگے هِمْ کا مضاف ہونے کی وجہ سے لام تعریف اور تنوین سے خالی ہے۔ آگے 'وٗ عطف کا ہے اَنَّ حرف مشبہ بالفعل، هُمْ اس کا اسم، اِلَيْهِ متعلق فعل ہے اور رٰجِعُوْنَ خبر۔ یہ جملہ عطف ہے اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ پر اور عطف اور معطوف مل کر مفعول ہیں يَظُنُّوْنَ کا اور یہ قائم مقام ہے دو مفعولوں کے۔ جملہ فعلیہ يَظُنُّوْنَ اپنے فاعل اور مفعول کے ساتھ مل کر صلہ ہے، اَلَّذِيْنَ کا۔ صلہ اور موصول مل کر صفت ہے اَلْخٰشِعِيْنَ کی۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ	اَلَّذِيْنَ	يَظُنُّوْنَ	اَنَّهُمْ	مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ
البقرۃ:46	وہ لوگ جو	یقین کرتے ہیں	کہ وہ	اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں

وَ اَنَّهُمْ	اِلَيْهِ	رٰجِعُوْنَ ۝۴۶
اور یہ کہ وہ	اس کی طرف ہی	لوٹنے والے ہیں

نوٹ علماء کرام نے قرآن مجید میں اس فرق کو سمجھنے کے لیے کہ کہاں ظن، یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کہاں شک کے معنی میں، کچھ ضابطے بیان کیے ہیں۔ مثلاً ہر وہ مقام جہاں ظن کی تعریف آئی ہے اور اس پر ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہاں یقین مراد ہے اور ہر وہ مقام جہاں اس کی مذمت آئی ہے اور اِس پر عذاب کی دھمکی دی گئی ہے وہاں یہ شک اور وہم کے معنی میں ہے۔ ہر وہ مقام جہاں اس کے بعد اَنَّ یا اَنْ آئے وہاں یہ یقین کے معنی دیتا ہے چاہے حقیقت کے اعتبار سے وہ یقین صحیح ہو یا غلط مثلاً ﴿قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ﴾ (2/البقرۃ:249) ''وہ لوگ جن کو یقین تھا کہ وہ ملاقات کرنے والے ہیں اللہ سے، انہوں نے کہا۔'' ﴿وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝۲۸﴾ (75/القیامۃ:28) ''اور اس (جان) نے یقین کر لیا کہ اب جدائی ہے۔'' اور آیت زیر مطالعہ میں فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ﴾ ''وہ لوگ جن کو یقین ہے کہ وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب سے۔'' ﴿اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ

مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۚ﴾ (69/الحاقۃ:20) ''مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا۔'' ان آیات میں ظن، یقین کا معنی دے رہا ہے اور یہ یقین حقیقت کے اعتبار سے صحیح بھی ہے۔ اب یہ آیات دیکھیں ﴿وَ ظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَا﴾ (10/یونس:24) ''اور یقین کرلیا اس کے مالکوں نے کہ (اب) انہوں نے قابو پالیا ہے اس پر۔'' ﴿وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ۝﴾ (28/القصص:39) ''انہوں نے یہ گمان کیا کہ انہیں ہماری طرف نہیں لوٹایا جائے گا۔'' ﴿بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ﴾ (48/الفتح:12) ''اور تمہیں یقین تھا کہ اب رسولؐ کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔'' ۔ اِن آیات میں ظن، یقین ہی کا معنی دے رہا ہے لیکن یہ یقین حقیقت کے اعتبار سے غلط ہے۔ اسی طرح حضرت یونسؑ کے بارے میں فرمایا: ﴿وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ (21/الانبیاء:87) ''اور یاد کرو ذوالنون کو جب وہ چل دیے غضبناک ہوکر اور یہ خیال کیا کہ ہم ان پر کوئی گرفت نہیں کریں گے۔'' یہاں بھی حضرت یونسؑ کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ان سے اس معاملے میں سختی نہیں کریں گے کہ جب وہ اللہ کے لیے اپنی قوم سے ناراض ہوکر چل دیے لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ یقین غلط ثابت ہوا۔ اسی لیے امام راغبؒ کے نزدیک یہاں ظن بمعنی وہم لینا بہتر ہے۔ (واللہ اعلم)۔ اور قرآن مجید میں وہ آیات جہاں ظن، وہم اور شک کے معنوں میں ہے وہاں عام طور پر اس سے پہلے اِنَّ یا اِنْ آتا ہے یا ظن کے مقابلے میں کوئی ایسا لفظ ہوتا ہے جو اِس کے مفہوم کو شک اور وہم کے ساتھ مخصوص کرتا ہے یا اِس کی کوئی ایسی صفت بیان کی جاتی ہے جس سے اس کی مذمت ہوتی ہے مثلاً ﴿اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۚ﴾ (53/النجم:28) ''بیشک ظن، حق کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں آتا۔'' اس مثال میں اِنَّ اور ظنّ کے مقابلہ میں حق، دونوں باتیں ظنّ کے معنی وہم وشک بتا رہی ہیں۔ ﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝﴾ (45/الجاثیہ:32) ''ہم تو اُسے محض وہم ہی خیال کرتے ہیں اور اس پر یقین نہیں آتا۔'' اس مثال میں اِنْ اور ظنّ کے مقابلہ میں یقین کے الفاظ ظن کے معنی وہم بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح الفتح:6 میں ظَنَّ السَّوْءِ (برا خیال) اور آل عمران:154 میں ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ (جاہلیت کا گمان) کے الفاظ سے اس کی مذمت کی گئی ہے۔

اب قرآن مجید میں سورۃ الحجرات کی آیت 12 دیکھیں جس میں فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ ''اے ایمان والو دور رہا کرو بکثرت بدگمانیوں سے بلاشبہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔'' اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''ان کلمات کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مطلقاً ظن سے نہیں روکا اور نہ ہر قسم کے ظن کو گناہ کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی ظن جائز ہیں۔ اس لیے علمائے کرام نے ظن کی متعدد قسمیں ذکر کی ہیں: واجب، مستحب، مباح اور ممنوع۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کرنا واجب ہے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنے وصال سے تین روز پہلے فرمایا: لا یموتن احدکم الا وھو یحسن الظن باللہ عزوجل۔ تم میں سے کوئی نہ مرے مگر اس حالت میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہو۔ دوسرا ارشادِ نبویؐ ہے۔ یقول اللہ انا عند ظن عبدی بی فلیظن ماشاء کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں اپنے بندے کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہوں جس کا وہ مجھ سے ظن رکھتا ہے۔ اب اس کی مرضی جیسا چاہے میرے ساتھ ظن رکھے۔ مستحب کی مثال: مومن کے ساتھ جس کا ظاہری حال اچھا ہو حسن ظن کرنا مستحب ہے۔ ایسا شخص جس کے احوال مشکوک ہوں اس کے متعلق سوءِ ظن کرنا مباح ہے، لیکن جب تک یقینی دلائل موجود نہ ہوں، اس وقت تک محض ظن کے مطابق اس کے خلاف کارروائی کرنا جائز نہیں۔ اسی کے متعلق حضورؐ کی حدیث ہے۔ اذا ظننتم فلا تحقّقوا۔ یعنی اگر کسی کے بارے میں شبہ پیدا ہو جائے تو اس کی تحقیق میں نہ لگ جاؤ۔ شریعت میں نصوص کے خلاف ظن وتخمین سے کام لینا ممنوع ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ۴، ص ۵۹۶)۔ بعض لوگوں نے سورہ یونس کی آیت 36 ﴿وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ط اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ط﴾ ''اور نہیں پیروی کرتے ان میں سے اکثر مگر محض وہم وگمان کی بلاشبہ وہم وگمان بے نیاز نہیں کرسکتا حق سے ذرہ بھر۔'' سے حجیّتِ حدیث میں شک وشبہے پیدا کیے ہیں جو کہ بالکل غلط ہے۔ اس کے جواب کے لیے حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی صاحبؒ کی ترجمان السنۃ اور حضرت پیر کرم شاہ صاحبؒ کی سنت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صفحات 186 تا 200 تک کا مطالعہ انشاء اللہ مفید رہے گا۔

آیت:47

﴿ يٰبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِيَ الَّتِيٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّيۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ ﴾

اِبۡنٌ: البقرۃ آیت40 دیکھیں۔	اِسۡرَآءِيۡلَ: البقرۃ آیت40 دیکھیں۔	اُذۡكُرُوۡا (ذ ک ر): البقرۃ آیت40 دیکھیں۔
نِعۡمَةٌ اور اَنۡعَمۡتُ (ن ع م): الفاتحہ آیت6 دیکھیں۔		

ف ض ل

(ن) فَضۡلًا کسی چیز کا درمیانی درجے یا حق سے زیادہ ہونا۔ اس مادے میں ''زیادتی'' کا مفہوم ہوتا ہے۔ یہ پسندیدہ بھی ہے جیسے علم، حلم، حیاء یا رتبہ میں زیادہ ہونا۔ اور ناپسندیدہ بھی ہے جیسے غصے وغیرہ میں زیادہ ہونا۔ عام طور پر پسندیدہ چیز کے لیے فَضۡلٌ اور ناپسندیدہ چیز کے لیے فُضُوۡلٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ باب (ک) میں اس کا مطلب ہوتا ہے صاحب فضل ہونا۔ یعنی کسی شخص میں ایسی صفات ہونا جس سے وہ دنیا میں مدح وثناء کا مستحق ہو اور آخرت میں اجر وثواب کا۔ قرآن مجید میں ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوا۔

فَضۡلٌ ج: فَضَآئِل۔ اسم ذات بھی ہے۔ حق سے زیادہ دی ہوئی چیز۔ بڑائی۔ بزرگی۔ فضیلت۔ روزی۔ فضائل کا لفظ رذائل کے مقابلے پر بولا جاتا ہے۔ فضائل بمعنی اخلاق فاضلہ اور اخلاق حمیدہ اور رذائل بمعنی اخلاق رذیلہ یعنی برے اخلاق۔ ﴿ قُلۡ اِنَّ الۡفَضۡلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ ﴾ (3/آل عمران:73) ''آپ کہہ دیجئے یقیناً بڑائی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ دیتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔'' ﴿ وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ ؕ ﴾ (2/البقرۃ:237) ''اور آپس کی فضیلت اور بزرگی کو فراموش نہ کرو۔'' روزی اور مالی نفع کو اکثر قرآن میں فضل کہا گیا ہے۔ مثلاً: ﴿ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانۡتَشِرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ ﴾ (62/الجمعۃ:10) ''پھر جب نماز پوری ہو چکے تو زمین پر چلو پھرو اور اللہ کی روزی تلاش کرو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ﴿ فَانۡقَلَبُوۡا بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضۡلٍ ﴾ (3/آل عمران:174) ''نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی نعمت وفضل کے ساتھ وہ لوٹے۔'' اس آیت میں فضل سے مراد وہ مالی نفع ہے جو بدر صغریٰ میں تجارت کے ذریعے سے حاصل ہوا۔ اس طرح کی اور بھی کئی آیات ہیں۔ یاد رہے کہ فَضۡلٌ کے اصل معنی ''زیادتی'' کے ہیں۔ اس لیے اس کا اطلاق مال ودولت پر بھی ہوتا ہے جو بطور نفع انسان کو حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ کے عطیہ پر بھی خواہ وہ دنیوی ہو یا اخروی۔

(تفعیل) تَفۡضِيۡلًا کسی پسندیدہ چیز میں کسی کو زیادہ کرنا۔ زیادہ دینا۔ فضیلت دینا۔ بزرگی عطا کرنا۔ ﴿ تِلۡكَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ۘ ﴾ (2/البقرۃ:253) ''یہ رسول ہیں، ہم نے فضیلت دی ان میں سے بعض کو بعض پر۔'' ﴿ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ فِى الرِّزۡقِ ۚ ﴾ (16/النحل:71) ''اور اللہ نے زیادہ کیا تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں۔'' مصیبت زدہ کو دیکھ کر پڑھنے کی مسنون دعا ہے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِيۡ عَافَانِيۡ مِمَّا ابۡتَلَاكَ بِهٖ وَفَضَّلَنِيۡ عَلٰى كَثِيۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقَ تَفۡضِيۡلًا۔

(تفعّل) تَفَضُّلًا بڑا بننا۔ فضیلت حاصل کرنا۔ عَلٰى کے صلے کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ يُرِيۡدُ اَنۡ يَّتَفَضَّلَ عَلَيۡكُمۡ ؕ ﴾ (23/المومنون:24) ''یہ تم پر فضیلت اور بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

اَلْعٰلَمِیْنَ (ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ترکیب یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ . . . عَلَیْکُمْ تک کی ترکیب کے لیے آیت 40 دیکھیں۔ وَاَنِّیْ میں 'وْ' عطف کا ہے اور اَنِّیْ، نِعْمَتِیْ پر عطف ہے۔ اَنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے، 'یْ' اس کا اسم ہے اور جملہ فعلیہ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ اس کی خبر ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:47

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ	اذْکُرُوْا	نِعْمَتِیَ	الَّتِیْٓ	اَنْعَمْتُ
اے اسرائیل کے بیٹو	تم لوگ یاد کرو	میری نعمت کو	جس کو	میں نے انعام کیا

عَلَیْکُمْ	وَاَنِّیْ	فَضَّلْتُکُمْ	عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾
تم پر	اور یہ کہ	میں نے فضیلت دی تم کو	تمام جہانوں پر

نوٹ صاحبؒ تفسیر عثمانی فرماتے ہیں: ''اہل عالم پر فضیلت کا یہ مطلب ہے کہ جس وقت سے بنی اسرائیل کا وجود ہوا تھا اس وقت سے لے کر اس خطاب کے نزول تک تمام فرقوں سے افضل رہے کوئی اُن کا ہم پلہ نہ تھا، جب انہوں نے نبی آخر الزمان اور قرآن کا مقابلہ کیا تو وہ فضیلت بالکل جاتی رہی اور مغضوب علیھم اور ضلال کا لقب عنایت ہوا۔ اور حضورؐ کے متبعین کو کنتم خیر امۃ کا خلعت ملا۔'' (تفسیر عثمانی، ص ۱۰)

آیت:48

﴿ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ ﴾

اِتَّقُوْا (و ق ی): البقرۃ آیت 2 دیکھیں۔ یَوْمٌ: الفاتحہ آیت 3 دیکھیں۔

ج ز ی

(ض) جَزَاءً (1) کسی چیز کا کسی کے لیے کافی ہونا۔ (2) بدلہ دینا۔ یہ لفظ خیر کے بدلے میں اچھی جزا دینے اور برائی کے بدلے میں سزا دینے، دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جب بدلہ دینے کا مفہوم ہو تو عام طور پر یہ دو مفعول کا تقاضا کرتا ہے یعنی کس کو بدلہ دیا اور کیا بدلہ دیا پھر 'ب' کے صلے کے ساتھ اُس چیز کا ذکر ہوتا ہے جس چیز کی وجہ سے بدلہ دیا جائے۔ مثلاً ﴿ وَ لَنَجْزِیَنَّ الَّذِیْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ﴾ (16/النحل:96) ''اور ہم ضرور عطا کریں گے انہیں جنہوں نے (ہر مصیبت میں) صبر کیا ان کا اجر ان کے اچھے اور مفید کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن) ﴿ سَنَجْزِی الَّذِیْنَ یَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰیٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا کَانُوْا یَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ ﴾ (6/الانعام:157) ''عنقریب ہم سزا دیں گے اُنہیں جو منہ موڑتے ہیں ہماری آیتوں سے برے عذاب سے اس وجہ سے کہ وہ منہ پھیرا کرتے تھے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ کبھی ایک مفعول ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿ لِیَجْزِیَ اللّٰهُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِهِمْ ﴾ (33/الاحزاب:24) ''تاکہ اللہ جزائے خیر دے سچوں کو اُن کے سچ کے

باعث۔‘‘(3) جب اس کے ساتھ عَنْ کا صلہ استعمال ہوتو مطلب ہوتا ہے کسی کے کام آنا جیسے آیت زیر مطالعہ میں فرمایا:﴿لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ﴾’’کام نہیں آئے گی کوئی جان کسی جان کے۔‘‘ یا فرمایا:﴿لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِہٖ﴾(31/لقمان:34)’’کام نہ آئے کوئی باپ اپنے بیٹے کے بدلے۔‘‘(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔کسی کے حسن سلوک پر مسنون کلمہ جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا اسی سے ہے۔

جَزَاءٌ اسم ذات بھی ہے۔وہ چیز جو کافی ہو۔بدلہ۔خیر کے بدلے میں خیر اور شر کے بدلے میں شر جَزَاءٌ کہلاتا ہے۔﴿فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ﴾(2/البقرۃ:85)’’تو اس کا کیا بدلہ ہے جو یہ کرے تم میں سے۔‘‘

جَازٍ اسم الفاعل ہے۔بدلہ دینے والا۔کام آنے والا۔کافی ہونے والا۔﴿وَ لَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا﴾(31/لقمان:33)’’اور نہ کوئی اولاد کام آئے گی اپنے والد کے کچھ بھی۔‘‘

جِزْیَةٌ اسم ذات ہے۔امان کا بدلہ۔وہ ٹیکس جو اسلامی حکومت اپنے غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) سے وصول کرتی ہے اور اسے جِزْیَةٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ان کی جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں ہوتا ہے۔﴿حَتّٰى یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ﴾(9/التوبۃ:29)’’یہاں تک کہ وہ لوگ جزیہ ادا کریں ہاتھ سے۔‘‘

(مفاعلہ) مُجَازَاةً اور جِزَاءً بدلہ دینا۔﴿وَهَلْ نُجٰزِیْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۝﴾(34/سبا:17)’’اور ہم یہ بدلہ اُسی کو دیتے ہیں جو ناشکرہو۔‘‘(ترجمہ شیخ الہندؒ)

نَفْسٌ(ن ف س): البقرۃ آیت9 دیکھیں۔ شَیْءٌ: البقرۃ آیت20 دیکھیں۔

ق ب ل

(ن) قَبْلًا کسی کی طرف توجہ کرنا۔قرآن مجید میں اس باب سے فعل استعمال نہیں ہوا۔

(ف) قَبْلًا کسی چیز کا نزدیک ہونا۔قریب ہونا۔پہلے واقع ہونا۔قرآن مجید میں اس باب سے بھی فعل استعمال نہیں ہوا۔

(س) قَبُوْلًا، قُبُوْلًا کسی چیز کو لے لینا۔قبول کرنا۔﴿اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ﴾(9/التوبۃ:104)’’کیا وہ لوگ نہیں جانتے کہ اللہ ہی قبول کرتا ہے توبہ کو اپنے بندوں سے۔‘‘﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾(3/آل عمران:37)’’پھر قبول فرمایا اُسے اُس کے رب نے بڑی ہی اچھی قبولیت کے ساتھ۔‘‘اور آیت زیر مطالعہ۔

قَابِلٌ اسم الفاعل ہے۔قبول کرنے والا۔﴿غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ﴾(40/المومن:30)’’گناہ کا بخشنے والا اور توبہ کا قبول کرنے والا۔‘‘

قَبْلُ البقرہ آیت4 کے تحت دیکھیں۔

قُبُلٌ (1) کسی چیز کا آگے کا حصہ۔﴿اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۝﴾(12/یوسف:26)’’اگر اس کی قمیض پھٹی ہے آگے سے تو عورت نے سچ کہا اور وہ جھوٹوں میں سے ہے۔‘‘(2) آنکھوں کے سامنے۔﴿وَ حَشَرْنَا عَلَیْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا﴾(6/الانعام:111)’’اور زندہ کر دیں ہم ہر چیز کو اُن کے سامنے۔‘‘(ترجمہ شیخ الہندؒ)

قِبَلٌ یہ دو معانی میں آتا ہے۔(1) طرف۔سمت۔﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ﴾(2/البقرۃ:177)’’نیکی یہی نہیں ہے کہ تم لوگ پھیر لو اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف۔‘‘﴿فَمَالِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِیْنَ ۝﴾(70/المعارج:36)’’پس کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ تیری طرف دوڑتے آتے ہیں۔‘‘

(2) طاقت۔قدرت۔﴿فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا﴾ (27/النمل:37)''تو ہم لازماً پہنچیں گے ان کے پاس ایسے لشکروں کے ساتھ جس پر کسی قسم کی کوئی طاقت نہیں ہوگی ان کو۔''

قِبْلَةٌ اسم ذات ہے۔قبلہ۔وہ''سمت''(معارف القرآن) یا''مکان''(تفسیر ماجدیؒ) جس کی طرف متوجہ ہوا جائے۔عرف عام میں اس سمت یا مکان (کعبہ) کو قبلہ کہا جاتا ہے جس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے۔اصل لغت کے اعتبار سے سامنے والے آدمی کی حالت کو قبلہ کہا جاتا ہے پھر یہ لفظ سامنے والے آدمی اور سامنے کی سمت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ (2/البقرۃ:144)''تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپؐ کو اُس قبلے کی طرف جسے آپؐ پسند کرتے ہیں۔''اور سورۂ یونس کی آیت 87 میں جو فرمایا﴿وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً﴾ تو اس آیت مبارکہ میں قبلہ کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔پہلا یہ کہ اپنے گھروں کو ہی نماز پڑھنے کی جگہ بنالو اور دوسرا یہ کہ اپنے گھروں کو قبلہ رخ بناؤ۔ہمارے بزرگوں نے آیت کا ترجمہ دونوں طرح سے کیا ہے۔''اور تم لوگ اپنے گھروں ہی کو نماز گاہ قرار دے لو۔''(ترجمہ ماجدیؒ)''اور تم سب اپنے انہی گھروں کو نماز پڑھنے کی جگہ قرار دے لو۔''(ترجمہ احسن البیان)''اور بناؤ اپنے گھر قبلہ رو۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)''اور بناؤ اپنے ان گھروں کو قبلہ رُخ۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)

قَبِيْلٌ (1) سامنے۔﴿اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا﴾ (17/بنی اسرائیل:92)''یا لے آ اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(2) ج: قُبُلٌ۔جماعت۔گروہ۔مختلف اقسام﴿اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ (7/الاعراف:27)''وہ دیکھتا ہے تم کو اور اُس کی قوم جہاں سے تم اُن کو نہیں دیکھتے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔(نوٹ:قُبُلٌ کا لفظ 'کسی چیز کے آگے کے حصے' اور 'آنکھوں کے سامنے' کے معنوں میں استعمال ہونے کے علاوہ قَبِيْلٌ کی جمع بھی ہے بمعنی گروہ۔جماعت۔)

قَبِيْلَةٌ ج:قَبَآئِلُ۔قبیلہ۔قبیلہ اس گروہ کو کہتے ہیں جو ایک ہی باپ کی نسل سے ہو۔﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾ (49/الحجرات:13)''اے لوگو بے شک ہم نے تم کو پیدا کیا ایک مرد اور ایک عورت سے اور بنایا تم کو شاخیں اور قبیلے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔''

(افعال) **اِقْبَالًا** کسی کے سامنے ہونا۔کسی کے سامنے یا آگے آنا۔کسی کی طرف متوجہ ہونا یا رخ کرنا۔﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ﴾ (68/القلم:30)''تو سامنے ہوئے ان میں سے ایک دوسرے کے، باہم ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہوئے۔''﴿وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا﴾ (12/یوسف:82)''اور پوچھ لے اُس بستی سے جس میں ہم تھے اور اُس قافلے سے جس میں ہم آئے ہیں۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

اَقْبِلْ فعل امر ہے۔تو آگے آ۔سامنے آ۔﴿يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ﴾ (28/القصص:31)''اے موسیٰؑ سامنے آ اور مت ڈر۔''

(تفعّل) **تَقَبُّلًا** اس طرح قبول کرنا جس میں اجر و ثواب دینا شامل ہو۔﴿قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (5/المائدہ:27) ''اس نے کہا اللہ تو بس قبول کرتا ہے متقی لوگوں سے۔''

تَقَبَّلْ فعل امر ہے۔تو قبول کر۔﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ (2/البقرہ:127)''اے ہمارے رب! تو قبول فرما ہم سے بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔''

(تفاعل) تَقَابُلًا ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہونا۔ آمنے سامنے ہونا۔

مُتَقَابِلٌ ج: مُتَقَابِلُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ آمنے سامنے ہونے والا۔ ﴿عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝﴾ (37/الصافات:44) ''تختوں پر آمنے سامنے ہونے والے۔''

(استفعال) اِسْتِقْبَالًا کسی کی طرف متوجہ ہونا۔ کسی کے سامنے آنا۔ خوش آمدید کہنا۔ اسی سے ہے: استقبال القبلۃ (قبلہ رخ ہونا)۔

مُسْتَقْبِلٌ اسم فاعل ہے۔ سامنے آنے والا۔ ﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ﴾ (46/الاحقاف:24) ''پھر جب انہوں نے دیکھا اس (عذاب) کو بادل جیسا، اپنی وادیوں کے سامنے آنے والا۔'' یہی لفظ آنے والے زمانے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ زمانۂ مستقبل۔

ش ف ع

(ف) شَفْعًا کسی چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا کر جوڑا بنانا۔ جفت کرنا۔

(ف) شَفَاعَةٌ سفارش کرنا۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: الشفاعه کے معنی دوسرے کے ساتھ اس کی مدد یا سفارش کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں۔ عام طور پر کسی بڑے باعزت آدمی کا اپنے سے کم تر کے ساتھ اس کی مدد کے لیے شامل ہو جانے پر (یہ لفظ) بولا جاتا ہے۔'' اور مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''لفظی معنی ملنے یا ملانے کے ہیں اِس لیے شفع عربی میں جوڑے کے معنی میں آتا ہے اِس کے مقابلے میں لفظ وتر بمعنی طاق استعمال ہوتا ہے۔ اِس لیے شفاعت کے لفظی معنی ہوئے کہ کسی کمزور طالب حق کے ساتھ اپنی قوت ملا کر اِس کو قوی کر دیا جائے یا بیکس اکیلے شخص کے ساتھ مل کر اِس کو جوڑا بنا دیا جائے۔'' ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ﴾ (2/البقرہ:255) ''کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر اس کی اجازت سے۔'' سفارش اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بری بھی۔ اچھی سفارش کرنے والے کو اس کا اجر ملتا ہے اور بری سفارش کرنے والے کو اس کا گناہ ملتا ہے جیسے قرآن مجید میں فرمایا: ﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ﴾ (4/النساء:85) ''جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا اور جو بری بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے گناہ) میں سے حصہ ملے گا۔''

شَفْعٌ ایسا عدد جو دو سے تقسیم ہو جائے۔ جفت۔ ﴿وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۙ۝﴾ (89/الفجر:3) ''قسم ہے جفت کی، قسم ہے طاق کی۔''

شَفَاعَةٌ اسم ذات بھی ہے۔ سفارش۔ ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ۝﴾ (74/المدثر:48) ''تو نفع نہیں دے گی ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش۔''

شَافِعٌ ج: شَافِعُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ سفارش کرنے والا۔ اوپر آیت (74/المدثر:48) دیکھیں۔ حدیث مبارک میں قرآن مجید کے بارے میں فرمایا اَلْقُرْاٰنُ شَافِعٌ وَّمُشَفَّعٌ۔ قرآن شافع ہے مطلب سفارش کرے گا اور مُشَفَّعٌ ہے یعنی اُس کی سفارش قبول کی جائے گی۔ (بحوالہ مفردات القرآن)۔

شَفِيْعٌ ج: شُفَعَآءُ۔ فَعِيْلٌ کا وزن ہے۔ ہمیشہ اور ہر حال میں سفارش کرنے والا۔ ﴿لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ﴾ (6/الانعام:70) ''اس کے لیے نہیں ہے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ ہی کوئی سفارش کرنے والا۔'' ﴿وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ (10/یونس:18) ''اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہماری سفارش کرنے والے

ہیں اللہ کے پاس۔'' واضح رہے کہ تمام قرآنِ مجید میں شُفَعَآءُ کی املاء اسی طرح عین الف کے ساتھ ہے مگر سورۂ روم کی آیت 13 میں یہ عین واؤ کے ساتھ اس طرح لکھا گیا ہے شُفَعٰٓؤُا۔ (بحوالہ لغات القرآن، ج ۳، ص ۲۸۷)۔

ء خ ذ

(ن) اَخَذًا، اَخْذَۃً: اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کو احاطہ میں لے لینا یا کسی چیز کا احاطہ کرنا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ پھر یہ لفظ کسی چیز کو پکڑنے اور کسی چیز کو لے لینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ﴾ (7/الاعراف:150) ''اور اس نے پکڑا اپنے بھائی کے سر کو۔'' ﴿وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ (5/المائدۃ:12) ''اور لے چکا ہے اللہ بنی اسرائیل سے پختہ وعدہ۔'' ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ (2/البقرۃ:255) ''نہیں پکڑ سکتی اُس کو اونگھ اور نہ نیند۔'' ﴿فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا﴾ (73/المزمل:16) ''تو ہم نے اُس کو بڑی سختی سے پکڑ لیا۔'' ﴿فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً﴾ (69/الحاقۃ:10) ''تو اللہ نے پکڑ لیا اُنہیں بڑی سختی سے۔'' جب اس کے ساتھ 'ب' کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے آمادہ کرنا، اکسانا۔ مثلاً: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ (2/البقرۃ:206) ''اور جب کہا جائے اُسے کہ (میاں) خدا سے ڈرو تو اور اکساتا ہے اسے غرور گناہ پر۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ''اور جب اُس سے کہا جاتا ہے کہ خوف خدا کرو تو اُسے نخوت گناہ پر (اور زیادہ) آمادہ کر دیتی ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔

خُذْ: ج: خُذُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو پکڑ۔ تو لے۔ ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾ (9/التوبۃ:103) ''آپؐ لیں ان کے مال میں سے صدقہ۔'' ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (59/الحشر:7) ''اور تمہیں جو کچھ رسولؐ دے، لے لو اور جس چیز سے روکے، رک جاؤ۔''

اٰخِذٌ: ج: اٰخِذُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ پکڑنے والا۔ لینے والا۔ ﴿وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ﴾ (2/البقرۃ:267) ''اور تم لوگ نہیں ہو اس کو لینے والے مگر یہ کہ تم لوگ چشم پوشی کرو اس سے۔''

(مفاعلہ) مُؤَاخَذَۃً: کسی کو کسی غلطی پر پکڑنا۔ مواخذہ کرنا۔ جواب طلبی کرنا۔ ﴿قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ﴾ (18/الکہف:73) ''حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ میری بھول پر مجھے نہ پکڑیئے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

(افتعال) اِتِّخَاذًا: کسی کو کچھ بنانا۔ اس کا فعل عام طور پر دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ یعنی کس کو بنایا اور کیا بنایا۔ ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ (4/النساء:125) ''اور بنایا اللہ نے ابراہیمؑ کو دوست۔'' ﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ﴾ (2/البقرۃ:54) ''اور یاد کرو جب کہا موسیٰؑ نے اپنی قوم سے اے میری قوم بیشک تم نے ظلم ڈھایا اپنے آپ پر بچھڑے کو (خدا) بنا کر۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اور کبھی ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے مثلاً: ﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ (2/البقرۃ:116) ''اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ایک بیٹا بنایا۔''

اِتَّخِذْ: ج: اِتَّخِذُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو بنا۔ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا﴾ (73/المزمل:9) ''کوئی معبود نہیں سوائے اس کے، پس تو بنا اس کو وکیل یعنی کام بنانے والا۔'' ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ (2/البقرۃ:125) ''اور تم لوگ بناؤ ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ میں سے نماز کی جگہ۔''

مُتَّخِذٌ: ج: مُتَّخِذُوْنَ۔ اسم فاعل ہے۔ بنانے والا۔ واحد مذکر۔ ﴿وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا﴾ (18/الکہف:51) ''اور میں نہیں ہوں گمراہ کرنے والوں کو بنانے والا بازو یعنی مشیر۔'' ﴿وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ﴾

(5/المائدۃ:5)''اور نہ چوری چھپے آشنا بناتے ہوئے۔''

مُتَّخِذَةٌ ج:مُتَّخِذَاتٌ۔اسم الفاعل ہے۔بنانے والی۔واحد مؤنث۔﴿وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ﴾(4/النساء:25)''اور نہ بنانے والی ہوں پوشیدہ یار۔''

ع د ل

(ض) عَدْلًا یہ لفظ ظاہری اور معنوی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے برابری کرنا۔عربی میں کہا جاتا ہے عَدَلْتُ هٰذا بِهٰذا میں نے اس کو، اس کے برابر کر دیا۔اسی طرح اَیَّامٌ مُعْتَدِلَاتٌ ان دِنوں کو کہا جاتا ہے جب رات اور دن برابر ہوں۔قرآن مجید میں فرمایا:﴿وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ﴾(6/الانعام:150)''اور وہ اپنے رب کے برابر کرتے ہیں (اوروں کو)۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ﴾(4/النساء:129)''اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں کو اگرچہ اس کی حرص کرو۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾(4/النساء:3)''لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے۔''(ترجمہ احسن البیان)۔

اس لفظ کا دوسرا مفہوم ہے کسی چیز کے برابر اس کا بدلہ دینا۔نیکی کا بدلہ نیکی سے اور برائی کا بدلہ برائی سے دینے کا نام عدل ہے۔قرآن مجید میں فرمایا:﴿وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا﴾(6/الانعام:70)''اور اگر بدلے میں دے سارے بدلے تو قبول نہ ہوں اس سے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

اس لفظ کا تیسرا مفہوم ہے انصاف کرنا۔حق دار کو اس کا حق ادا کرنا۔قرآن مجید میں فرمایا گیا:﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾(42/الشوریٰ:15)''اور مجھ کو حکم ہے کہ انصاف کروں تمہارے بیچ میں۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا﴾(4/النساء:135)''تو نہ پیروی کرو خواہش نفس کی انصاف کرنے میں۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔

اس معنی کے اعتبار سے عدل کا لفظ ذوی الاضداد سے ہے۔اگر یہ باب سمع سے آئے تو پھر اس کے معنی ظلم کرنا اور ناانصافی کرنا کے ہوتے ہیں۔لیکن ان معنوں میں فعل قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔(واللہ اعلم)۔

اس لفظ کا چوتھا مفہوم ہے کسی چیز کے توازن و تناسب کو قائم رکھنا۔کسی چیز کو معتدل بنانا کہ اس میں کوئی کمی بیشی نہ رہے۔قرآن مجید میں فرمایا:﴿الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ﴾(82/الانفطار:7)''جس نے تجھے پیدا کیا پھر تیرے (اعضاء کو) درست کیا پھر تیرے (عناصر کو) معتدل بنایا۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔

قرآن مجید میں مصدر عَدْلٌ بمعنی عَدَالَةٌ (معتبر) بھی استعمال ہوا ہے۔﴿وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾(65/الطلاق:2)''اور گواہ کر لو دو معتبر اپنے میں کے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

عُدُوْلًا عَدَلَ يَعْدِلُ کا مصدر اگر عُدُوْلٌ آئے تو مطلب ہوتا ہے راہِ راست سے انحراف کرنا، ہٹ جانا۔﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا﴾(4/النساء:135)''تو خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ (حق سے) ہٹ جاؤ۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ﴾(27/النمل:60)''مگر ہاں یہ لوگ ہیں ہی حق سے عدول کرنے والے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔حاشیے میں حضرت عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''یعدلون۔عدول سے ہے جس کے معنی حق سے انحراف اور کجی کے ہیں۔''

اِعْدِلُ ج:اِعْدِلُوْا۔فعل امر ہے۔تو برابر کر۔تو انصاف کر۔﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى﴾(6/الانعام:152)''اور جب بھی تم بولو تو انصاف کرو چاہے وہ شخص تمہارا قرابت دار ہی ہو۔''

عَدْلٌ اسم ذات بھی ہے۔کسی چیز کے برابر کوئی دوسری چیز۔بدلہ۔عدل۔انصاف۔﴿ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ ﴾(2/البقرہ:123)''اور قبول نہیں کیا جائے گا اس سے بدلہ اور نفع نہیں دے گی اس کو سفارش۔''﴿ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا ﴾(5/المائدۃ:95)''یا اس کے برابر روزے رکھنا۔''

ن ص ر

(ن) نَصْرًا، نُصْرَةً کسی کی مدد کرنا۔﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ ﴾(3/آل عمران:123)''اور یقیناً مدد کی تمہاری اللہ نے بدر میں۔''حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''نصر کا صلہ جب عَلٰی کے ساتھ آتا ہے تو معنی غلبے کے ہو جاتے ہیں اور غلبہ سے مراد دونوں ہیں بہ لحاظ دلائل وعلوم، غلبۂ علمی ومعنوی اور بہ لحاظ فتوحات جہاد، غلبہ مادی ومُلکی۔﴿ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾(2/البقرۃ:286)''سو ہم کو غالب کر کافر لوگوں پر۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔

نَصْرٌ اسم ذات بھی ہے۔مدد۔﴿ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾(2/البقرہ:214)''سن لو یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔''

اُنْصُرْ فعل امر ہے۔تو مدد کر۔﴿ وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾(2/البقرہ:250)''اور تو جما دے ہمارے قدموں کو اور تو مدد کر ہماری کافر قوم پر۔''

نَاصِرٌ ج: نَاصِرُوْنَ اور اَنْصَارٌ۔ اسم فاعل ہے۔ مدد کرنے والا۔ مددگار۔﴿ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴾(47/محمد:13)''ہم نے ہلاک کیا ان کو تو کسی قسم کا کوئی مددگار نہیں ہے ان کے لیے۔''﴿ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾(3/آل عمران:22)''اور نہیں ہیں اُن کے کوئی بھی مددگار۔''﴿ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ﴾(61/الصف:14)''حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں۔''قرآن مجید میں جہاں مہاجرین و انصار کا ذکر ہے وہاں انصار سے انصارِ مدینہ مراد ہیں جو نصرتِ نبیؐ کی بدولت اس لقب سے سرفراز کئے گئے۔

نَصِيْرٌ ج: اَنْصَارٌ۔ فَعِيْلٌ کا وزن ہے۔ ہمیشہ اور ہر حال میں مدد کرنے والا۔﴿ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴾(8/الانفال:40)''پس جان لو کہ اللہ تمہارا حمایتی ہے کیا ہی اچھا حمایتی اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔''

مَنْصُوْرٌ ج: مَنْصُوْرُوْنَ۔اسم المفعول ہے۔جس کی مدد کی جائے۔ مدد کیا ہوا۔﴿ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۖ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴾(17/بنی اسرائیل:33)''پس اسے چاہیے کہ زیادتی نہ کرے قتل میں یقیناً وہ مدد کیا گیا ہے۔''﴿ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴾(37/الصافات:172)''اُن کی ضرور مدد کی جائے گی۔''

نَصْرَانِيٌّ ج: نَصٰرٰى۔ اسم نسبت ہے۔ مدد والا۔اصطلاحاً یہ لفظ عیسائی لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔نَصْرَانِيٌّ کے ماخذ کے بارے میں اختلاف ہے۔بعض بزرگوں کی رائے ہے کہ یہ''ناصرہ'' کی طرف منسوب ہے جو کہ ملک شام (حال فلسطین) میں ایک قصبے کا نام ہے۔انگریزی میں اسے (Nazareth) کہتے ہیں۔حضرت عیسیٰؑ کا آبائی وطن یہی قصبہ تھا اور آپؑ''مسیح ناصری'' اسی مناسبت سے کہلاتے ہیں۔اور بعض بزرگوں کی رائے ہے کہ اس کا ماخذ''نُصْرَةٌ'' (مدد) ہے اور اِس کی وجہ وہ قول ہے جو حضرت عیسیٰؑ کے سوال مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (اللہ کی راہ میں کون میرے مدد گار ہیں) کے جواب میں حواریوں نے کہا تھا۔ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (ہم اللہ کے (دین کے) مددگار ہیں)۔(واللہ اعلم)۔﴿ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا ﴾(3/آل عمران:67)''ابراہیمؑ یہودی نہیں تھے اور نہ ہی نصرانی۔''﴿ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ﴾(2/البقرہ:113)''اور کہا یہودیوں نے کہ نہیں ہیں

عیسائی کسی چیز پر۔''

(تفاعل) تَنَاصُرًا ایک دوسرے کی مدد کرنا۔﴿ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴾(37/الصافات:25)''تم لوگوں کو کیا ہوا ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔''

(افتعال) اِنْتِصَارًا (1) مدد طلب کرنا۔(2) بدلہ لینا۔انتقام لینا۔(3) ظلم یا ظالم سے بچنا۔اپنے آپ کو کسی کے حملے سے بچانا۔﴿ وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾(42/الشوریٰ:41)''اور جو بدلہ لیتے ہیں اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد پس یہ لوگ ہیں جن پر کوئی ملامت نہیں۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴾(42/الشوریٰ:39)''اور جب اُن پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ اُس کا (مناسب) بدلہ لیتے ہیں۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔

اِنْتَصِرْ فعل امر ہے۔تو بدلہ لے۔﴿ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾(54/القمر:10)''تو اس نے پکارا اپنے رب کو کہ میں مغلوب ہوں پس تو بدلہ لے۔''

مُنْتَصِرٌ ج: مُنْتَصِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ بدلہ لینے والا۔ غالب۔ ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴾(54/القمر:44)''یا وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایسی جماعت ہیں جو غالب ہی رہے گی۔''

(استفعال) اِسْتِنْصَارًا مدد مانگنا۔﴿ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ ﴾(8/الانفال:72)''اور اگر وہ لوگ مدد مانگیں تم لوگوں سے دین میں تو تم لوگوں پر لازم ہے مدد کرنا۔''

ترکیب وَاتَّقُوْا میں 'وَ' عطف کا ہے اور اِتَّقُوْا گزشتہ آیت میں اُذْكُرُوْا پر عطف ہے۔اِتَّقُوْا فعل امر ہے اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل ہے۔ يَوْمًا اس کا مفعول ہے اور نکرہ موصوفہ ہے۔آیت کا اگلا حصہ يَوْمًا کی صفات بیان کر رہا ہے۔چنانچہ لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا، يَوْمًا کی پہلی صفت ہے۔اس میں لَا نافیہ ہے۔تَجْزِيْ مضارع معروف کا صیغہ ہے،اس کے بعد فِيْهِ محذوف ہے، نَفْسٌ اس کا فاعل ہے، عَنْ نَفْسٍ، جار مجرور متعلق فعل ہے اور شَيْـًٔا مفعول ہے۔آگے وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ، يَوْمًا کی دوسری صفت ہے۔اس میں 'وَ' عطف کا ہے 'لَا' نافیہ ہے، يُقْبَلُ، مضارع مجہول کا صیغہ ہے، اس کے بعد فِيْهِ محذوف ہے۔مِنْهَا اس سے متعلق ہے اور شَفَاعَةٌ، نائب الفاعل ہے۔مِنْهَا میں 'ھا' ضمیر نَفْسٌ کے لیے ہے۔شَفَاعَةٌ، مونث غیر حقیقی ہے اس لیے اس کا فعل تُقْبَلُ کی بجائے يُقْبَلُ بھی درست ہے۔اگلا جملہ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ، يَوْمًا کی تیسری صفت ہے۔اس میں 'وَ' عطف کا ہے۔'لَا' نافیہ ہے۔يُؤْخَذُ، مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔فِيْهِ محذوف ہے۔مِنْهَا اس سے متعلق ہے، 'ھا' ضمیر نَفْسٌ کے لیے ہے اور عَدْلٌ نائب الفاعل ہے۔اور اگلا جملہ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ، يَوْمًا کی چوتھی صفت ہے۔اس میں 'وَ' عطف کا ہے، 'لَا' نافیہ ہے هُمْ مبتدا ہے اور جملہ فعلیہ يُنْصَرُوْنَ اس کی خبر ہے۔يُنْصَرُوْنَ مضارع مجہول کا صیغہ ہے اور اس کا نائب الفاعل اس میں شامل ضمیر ہے۔اور اس کے بعد فِيْهِ محذوف ہے۔آخری صفت وَلَا يُنْصَرُوْنَ (بغیر هُمْ کے) بھی ہو سکتی تھی۔لیکن اس کو جملہ اسمیہ کی صورت میں بیان کرنے سے اس میں حصر اور تاکید کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔(واللّٰہ اعلم)۔

ترجمہ
البقرۃ:48

وَاتَّقُوْا	يَوْمًا	لَّا تَجْزِيْ	نَفْسٌ	عَنْ نَّفْسٍ
اور تم لوگ ڈرو	ایک ایسے دن سے جب	کام نہیں آئے گی	کوئی جان	کسی جان کے

شَيْـًٔا	وَّلَا يُقْبَلُ	مِنْهَا	شَفَاعَةٌ	وَّلَا يُؤْخَذُ
کچھ بھی	اور قبول نہیں کی جائے گی	اس سے	کوئی سفارش	اور نہیں لیا جائے گا

مِنْهَا	عَدْلٌ	وَلَا هُمْ	يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾
اس سے	کوئی بدلہ	اور نہ ہی وہ	مدد کیے جائیں گے

نوٹ:1 کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی نکرہ کی کوئی خصوصیت ایک یا چند فقروں یا جملوں میں بیان کی جاتی ہے۔ایسی صورت میں وہ نکرہ، محض نکرہ نہیں رہتا۔اسے نکرہ موصوفہ مخصّصہ کہتے ہیں۔اس بات کو اُردو کی مثال سے سمجھ لیں۔ہم کہتے ہیں ایک ٹھنڈا دن۔اب یہ کسی بھی ٹھنڈے دن کی بات ہوسکتی ہے۔اس لیے اس فقرہ میں دن کا لفظ محض نکرہ ہے۔اسے نکرہ محضہ کہتے ہیں۔لیکن اگر ہم کہیں ایک ایسا ٹھنڈا دن جب پانی جم جائے۔اس فقرہ میں بھی دن کا لفظ نکرہ ہے کیونکہ ایسا ٹھنڈا دن کوئی بھی دن ہوسکتا ہے۔لیکن عام ٹھنڈے دنوں کے بنسبت اس دن کی ایک خصوصیت ہے۔اس لیے اس فقرہ میں دن کا لفظ نکرہ محضہ نہیں رہا بلکہ نکرہ موصوفہ مخصّصہ ہوگیا۔

اسی طرح سے آیت زیرِ مطالعہ میں یَوْمًا کا لفظ نکرہ آیا ہے کیونکہ یہ ایک غیر معین دن ہے۔لیکن جب بھی یہ دن وقوع پذیر ہوگا تو کچھ خصوصیات کا حامل ہوگا جو آیت میں بیان کردی گئی ہیں۔اس لیے یہ نکرہ محضہ نہیں ہے بلکہ نکرہ موصوفہ مخصّصہ ہے۔ترجمہ کرتے وقت اس فرق کا لحاظ کرنا ہوتا ہے۔

نوٹ:2 اس آیت میں لفظ شَيْئًا کے استعمال کو سمجھنے کے لیے پہلے ہمیں مفعول مطلق کا استعمال سمجھنا ہوگا۔ہم کہتے ہیں میں نے اس کو مارا یعنی ضَرَبْتُهٗ۔ یہ ایک سادہ جملہ ہے۔لیکن اگر ہم کہتے ہیں میں نے اس کو ٹھیک ٹھاک مار ماری تو عربی کے جملہ میں یہ انداز پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس فعل کا ذکر ہو اسی فعل کا مصدر بطور مفعول لے آتے ہیں۔اور کہتے ہیں ضَرَبْتُهٗ ضَرْبًا۔ اب اس میں ضَرَبْتُ کے بعد هٗ اصل مفعول ہے اور ضَرْبًا مفعول مطلق ہے جس کی وجہ سے بات میں بہت زور پیدا ہوگیا ہے۔اسی طرح سے جَزَيْتُهٗ جَزَاءً یعنی میں نے اس کو بدلہ دیا جیسا بدلہ دیتے ہیں یا جیسا بدلہ دینے کا حق ہے۔

اب فرض کریں یہی بات ہم منفی انداز میں کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے اس کو بالکل نہیں مارا، تو اس کے لیے مَا ضَرَبْتُهٗ ضَرْبًا نہیں کہیں گے بلکہ منفی جملہ میں مفعول مطلق کے طور پر فعل کا مصدر لانے کے بجائے عام طور پر لفظ شَيْئًا لے آتے ہیں۔اس لیے کہیں گے مَا ضَرَبْتُهٗ شَيْئًا۔ میں نے اس کو کچھ بھی نہیں مارا۔اسی طرح سے مَا جَزَيْتُهٗ جَزَاءً کے بجائے مَا جَزَيْتُهٗ شَيْئًا کہیں گے۔میں نے اس کو کچھ بھی بدلہ نہیں دیا۔

اب نوٹ کریں کہ آیت میں اصل جملہ تھا لَا تَجْزِيْ فِيْهِ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ جَزَاءً۔ اس میں فِيْهِ محذوف کر دیا۔اور مفعول مطلق کے طور پر جَزَاءً کے بجائے شَيْئًا آیا ہے۔یعنی کوئی جان کسی جان کے کچھ بھی کام نہ آئے گی یا بدلہ میں ذرہ برابر بھی کوئی چیز نہ دے گی۔

آیت:49

﴿ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ ﴾

اِذْ: البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔

ن	ج	و

(ن) (ل) نَجَاةً اور نَجَاءً کسی کا کسی چیز سے الگ ہوجانا۔رہائی پانا۔نجات پانا۔﴿وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا﴾ (12/یوسف:45) ''اور کہا اُس شخص نے جس نے نجات پائی اُن دونوں میں سے۔'' ﴿قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾﴾ (28/القصص:25) ''انہوں نے کہا آپؑ (حضرت موسیٰؑ) مت ڈریں۔آپؑ نے نجات پائی ظالم قوم سے۔''

(ب) نَجْوًا اور نَجْوٰی سرگوشی کرنا۔ دو آدمیوں کا راز داری سے بات کرنا۔سرگوشی کے معنی میں ثلاثی مجرد سے فعل قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

نَاجٍ اسم الفاعل ہے۔نجات پانے والا۔﴿ وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا ﴾(12/یوسف:42)''اور حضرت یوسفؑ نے کہااس سے جس کے لیے انہوں نے خیال کیا کہ وہ نجات پانے والا ہے ان دونوں میں سے۔''

نَجِیٌّ یہ لفظ نَجْوٌ یا نَجْوٰی مصدر سے فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔فَعِیْلٌ کے وزن میں کبھی اسم الفاعل اور کبھی اسم المفعول کا مفہوم ہوتا ہے۔ چنانچہ نَجِیٌّ کا معنی دونوں طرح سے کیا گیا ہے۔بعض بزرگوں کے نزدیک اس کا معنی ''سرگوشی کرنے والا'' کے ہیں (مفردات القران، لغات القرآن) اور بعض بزرگوں کے نزدیک اس کا معنی ''وہ جس سے سرگوشی کی جائے یا جس سے راز کی بات کہی جائے'' کے ہیں (مصباح اللغات، معارف القرآن)۔بعض بزرگوں کے نزدیک اس کا مصدر تَنَاجٍ (تفاعل) ہے جس کے معنی ہیں ''باہم مشورہ کرنا''۔قرآن مجید میں یہ لفظ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورہ یوسف کی آیت 80 میں فرمایا﴿ فَلَمَّا اسْتَیْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا ؕ ﴾۔ اس آیت کا ترجمہ عام طور سے دو طرح کیا گیا ہے مثلاً:''پھر جب ناامید ہوئے اس سے اکیلے ہو بیٹھے مشورہ کرنے کو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''پھر جب وہ ان کی طرف سے مایوس ہو گئے تو علیحدہ باہم مشورہ کرنے لگے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔''پھر جب وہ مایوس ہو گئے یوسف سے تو الگ جا کر سرگوشی کرنے لگے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ گویا ہمارے بزرگوں نے اس آیت مبارکہ میں نَجِیٌّ کو نَجْوٌ ، نَجْوٰی یا تَنَاجٍ سے اسم الفاعل کے معنی میں لیا ہے۔اور دوسری جگہ سورہ مریم کی آیت 52 میں فرمایا﴿ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا ﴾ اس آیت مبارکہ میں عام طور پر نَجِیٌّ کو نَجْوٌ یا نَجْوٰی سے اسم المفعول،''جس سے سرگوشی کی جائے، جس سے راز کی بات کہی جائے'' کے معنی میں لیا گیا ہے اور اس کو قَرَّبْنٰهُ میں ضمیر مفعولی کا حال مانا گیا ہے۔''اور نزدیک بلایا اس کو بھید کہنے کو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''اور ہم نے ان کو مقرب بنایا راز کی گفتگو کے لیے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔اس آیت کے تحت حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''نَجِیًّا سرگوشی اور خصوصی کلام کو مناجات اور جس شخص سے ایسا کلام کیا جائے اُس کو نَجِیٌّ کہا جاتا ہے۔'' (معارف القرآن، ج۶،ص۳۹)۔

نَجْوَةٌ اسم ذات ہے۔رہائی۔نجات۔﴿ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَى النَّارِ ﴾(40/مومن:41)''میں بلاتا ہوں تم لوگوں کو نجات کی طرف اور تم لوگ بلاتے ہو مجھ کو آگ کی طرف۔''نَجْوَةٌ خاص قرآنی املاء ہے۔

نَجْوٰی اسم ذات بھی ہے۔سرگوشی۔﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰی ﴾(58/المجادلۃ:8)''کیا آپؐ نے ان لوگوں کے حال میں غور کیا جنہیں سرگوشی سے روک دیا گیا تھا۔''﴿ لَا خَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَیْنَ النَّاسِ ؕ ﴾(4/النساء:114)''نہیں کوئی بھلائی ان کی اکثر سرگوشیوں میں بجز ان لوگوں کے جو حکم دیں صدقہ دینے کا یا نیک کام کا یا صلح کرانے کا لوگوں میں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔نَجْوٰی کے ماخذ کے بارے میں ہمارے بزرگوں میں اختلاف ہے۔بعض کے نزدیک یہ باب نصر سے مصدر ہے بمعنی سرگوشی کرنا اور بطور اسم ذات (سرگوشی) استعمال ہوتا ہے۔بعض کے نزدیک یہ نَجْوَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں وہ اونچی زمین جو دوسری زمینوں سے ممتاز اور بلندی کی وجہ سے آس پاس کی زمینوں سے جدا ہو۔آہستہ اور راز سے کہی ہوئی بات بھی چونکہ کسی دوسرے کے سننے سے محفوظ ہو جاتی ہے اس لیے وہ نَجْوَةٌ کے مشابہ ہے۔اور بعض کے نزدیک یہ لفظ نجوت الشئ انجوہ سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو خالص اور منفرد کر لینا۔اسی مناسبت سے دو آدمی جو دوسرے لوگوں سے

الگ تھلگ ہو کر باتیں کرتے ہیں اس کو نَجْوٰی کہتے ہیں۔ یہ لفظ واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے مثلاً هُوَ نَجْوٰی اور هُمْ نَجْوٰی۔ اس لفظ کا استعمال بطور صفت بھی ہوتا ہے جیسے قَوْمٌ نَجْوٰی یعنی سرگوشی کرنے والے لوگ۔ قرآن مجید میں ہے ﴿وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى﴾(17/بنی اسرائیل:47)''اور جب وہ سرگوشی کررہے تھے۔'' اس صورت میں اس سے پہلے لفظ ذُوْ محذوف مانا جاتا ہے۔ اب نوٹ کرلیں کہ نَجْوٰی کا استعمال بطور مصدر (سرگوشی کرنا)، بطور اسم ذات (سرگوشی) اور بطور صفت (سرگوشی کرنے والا، والے) ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

(افعال) اِنْجَاءً کسی کو رہائی دینا۔ نجات دینا۔ ﴿اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾(14/ابراہیم:6)''جب اس نے رہائی دی تم کو آلِ فرعون سے۔''

(تفعیل) تَنْجِيَةً کسی کو رہائی دینا۔ نجات دینا۔ (اس میں تدریجاً نجات دینے کا مفہوم ہوتا ہے)۔ ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾(23/المومنون:28)''تمام حمد اللہ کے لیے ہے جس نے نجات دی ہم کو ظالم قوم سے۔''

نَجِّ فعل امر ہے۔ واحد مذکر حاضر کا صیغہ۔ تو نجات دے۔ تو چھٹکارا دے۔ ﴿وَّ نَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (26/الشعراء:118)''اور تو نجات دے مجھے اور میرے ساتھ جو ایمان والے ہیں انہیں بھی۔''

مُنَجٍّ ج: مُنَجُّوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ نجات دینے والا۔ ﴿اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ﴾(29/العنکبوت:33)''بے شک ہم نجات دینے والے ہیں آپؐ کو اور آپؐ کے گھر والوں کو۔''

(مفاعلہ) مُنَاجَاةً چپکے چپکے سے کان میں بات کہنا۔ کسی سے سرگوشی کرنا۔ راز داری سے مشورہ دینا۔ ﴿اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ط﴾(58/المجادلہ:12)''اور جب بھی تم لوگ سرگوشی کرو رسولؐ سے تو اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ دو۔''

(تفاعل) تَنَاجِيًا باہم ایک دوسرے سے سرگوشی کرنا۔ باہم خفیہ مشورہ کرنا۔ ﴿اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ﴾(58/المجادلہ:9)''تم جب سرگوشی کرو تو یہ سرگوشیاں گناہ اور ظلم (زیادتی) اور نافرمانی پیغمبر کی نہ ہوں۔'' (ترجمہ احسن البیان)''جب تم خفیہ مشورہ کرو تو مت خفیہ مشورہ کرو گناہ، زیادتی اور رسول کریمؐ کی نافرمانی کے متعلق۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

اٰلُ: البقرۃ آیت 41 دیکھیں۔

فِرْعَوْنُ ج: فَرَاعِنَةٌ۔ یہ کسی ایک متعین بادشاہ کا نام نہیں بلکہ قدیم مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''لفظ فرعون کے معنی ہیں ''سورج دیوتا کی اولاد'' قدیم اہل مصر سورج کو، جو اُن کا مہادیو یا رب اعلیٰ تھا، رَعْ کہتے تھے اور فرعون اسی کی طرف منسوب تھا۔ اہل مصر کے اعتقاد کی رو سے کسی فرماں روا کی حاکمیت کے لیے اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ رَعْ کا جسمانی مظہر اور اُس کا ارضی نمائندہ ہو، اسی لیے ہر شاہی خاندان جو مصر میں برسر اقتدار آتا تھا، اپنے آپ کو سورج بنسی بنا کر پیش کرتا، اور ہر فرماں روا جو تخت نشین ہوتا ''فرعون'' کا لقب اختیار کرکے باشندگانِ ملک کو یقین دلاتا کہ تمہارا رب اعلیٰ یا مہادیو میں ہوں۔

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کے سلسلہ میں دو فرعونوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک وہ جس کے زمانہ میں آپ پیدا ہوئے اور جس کے گھر میں آپ نے پرورش پائی۔ دوسرا وہ جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ لے کر پہنچے اور جو بالآخر غرق ہوا۔ موجودہ زمانہ کے محققین کا عام میلان اس طرف ہے کہ پہلا فرعون رعمسیس دوم تھا جس کا زمانۂ حکومت ۱۲۹۲ سے ۱۲۲۵ قبل مسیح تک رہا۔ اور دوسرا فرعون

جس کا یہاں اِن آیات میں ذکر ہو رہا ہے، (الاعراف:104) منفتہ یا منفتاح تھا جو اپنے باپ رعمسیس دوم کی زندگی ہی میں شریک حکومت ہو چکا تھا اور اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا مالک ہوا۔'' (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۶۴)۔ اور سورۂ یوسف کے تعارف میں فرماتے ہیں: ''قرآن مجید حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہ کو ''فرعون'' کے نام سے یاد نہیں کرتا۔ کیونکہ ''فرعون'' مصر کی مذہبی اصطلاح تھی اور یہ لوگ (چرواہے بادشاہ، Hyksos kings) مصری مذہب کے قائل نہ تھے لیکن بائیبل میں غلطی سے اس کو بھی ''فرعون'' ہی کا نام دیا گیا ہے شاید اس کے مرتب کرنے والے سمجھتے ہوں گے کہ مصر کے سب بادشاہ ''فراعنہ'' ہی تھے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۳۸۲)۔ امام راغبؒ نے اس کو ''ف رع ن'' (رباعی) مادہ کے تحت بیان کیا ہے کہتے ہیں کہ یہ عجمی لفظ ہے اور عربی زبان میں اس سے سرکشی کے معنی لے کر کہا جاتا ہے تَفَرْعَنَ فُلَانٌ یعنی فلاں نے سرکشی کی۔

س و م

(ن) سَوْمًا اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کی طلب میں کہیں جانا۔ چنانچہ سَوْمٌ کا مفہوم دو اجزاء سے مرکب ہے، طلب اور جانا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ پھر یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً (1) جانور کا چراگاہ میں جانا۔ جیسے سَامَتِ الْاِبِلُ اونٹ چراگاہ میں چرنے کے لیے چلے گئے۔ (2) کسی پر کوئی بوجھ ڈالنا یا اس کو تکلیف دینا۔ عربی میں کہتے ہیں سَامَهٗ ظُلْمًا وَ سَامَهٗ خَسْفًا، اس نے اس کو ظلم اور ذلت کا مزہ چکھایا۔ عربی زبان میں ''سَامَ خَسْفًا'' محاورہ ہے جس کا معنی ہے کسی کو تکلیف دینا اور ذلیل وخوار کرنا۔ ﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ﴾ (7/الاعراف:167) ''اور جب سنا دیا تیرے رب نے کہ وہ لازماً بھیجتا رہے گا ان پر قیامت کے دن تک اس کو جو تکلیف دے گا ان کو برے عذاب کی۔'' یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

سِيْمَاءٌ اسم ذات ہے۔ علامت۔ نشان۔ ﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ﴾ (2/البقرہ:273) ''تو پہچانے گا ان کو ان کی علامت سے، وہ لوگ نہیں مانگتے لوگوں سے لپٹتے ہوئے۔'' ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ﴾ (48/الفتح:29) ''ان (کے ایمان و عبادت) کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''سِیْمٰی سے مراد وہ گٹا نہیں جو عام طور پر پیشانی پر نمودار ہو جاتا ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو عبارت یوں ہوتی۔ سِیْمَاهُمْ فِیْ جِبَاهِهِمْ۔ ان کی پیشانیوں پر نشانیاں۔ بلکہ اس سے مراد وہ نورِ باطن ہے جو اُن کے چہروں پر نمایاں ہوتا ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ۴، ص ۵۶۹)

(افعال) اِسَامَةً مویشی کو چراگاہ میں لے جانا۔ چرانا۔ ﴿وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝﴾ (16/النحل:10) ''اور اس سے درخت ہیں، اس میں تم مویشی چراتے ہو۔''

(تفعیل) تَسْوِيْمًا اپنے اوپر یا کسی پر نشان لگانا۔

مُسَوِّمٌ ج: مُسَوِّمُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ نشان لگانے والا۔ نشان بنانے والا۔ ﴿اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝﴾ (3/آل عمران:125)۔ صاحبؒ قاموس القرآن اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: ''اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کرو گے اور کافر یکایک تم پر حملہ آور ہوں گے تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جو اپنے گھوڑوں پر علامت لگانے والے ہوں گے یا جن پر خود علامت لگی ہوگی۔'' اور آگے فرماتے ہیں: ''پہلے معنی مَسَوِّمِیْنَ پڑھنے کی صورت میں ہیں اور دوسرے مُسَوَّمِیْنَ پڑھنے کی صورت میں۔'' (قاموس القرآن، ص ۵۱۸)۔ آیت میں لفظ مُسَوِّمِیْنَ ہے لیکن ہمارے اکثر بزرگوں نے اس کا ترجمہ اسم المفعول کے معنی

میں کیا ہے مثلاً: ''اگر تم صبر کرو اور بچتے رہو اور وہ آئیں تم پر اُسی دم تو مدد بھیجے تمہارا رب پانچ ہزار فرشتے نشان دار گھوڑوں پر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''کیوں نہیں، بشرطیکہ تم نے صبر اور تقویٰ قائم رکھا اور اگر وہ تم پر فوراً آ پڑیں گے تو تمہارا پروردگار تمہاری مدد پانچ ہزار نشان کیے ہوئے فرشتوں سے کرے گا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ''ہاں کافی ہے بشرطیکہ تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور اگر آدھمکیں کفار تم پر تیزی سے اُسی وقت تو مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ''جو نشان دار ہوں گے۔'' (احسن البیان) (واللّٰہ اعلم)۔

مُسَوَّمٌ اسم المفعول ہے۔ نشان لگایا ہوا۔ نشان زدہ۔ واحد مذکر۔

مُسَوَّمَةٌ اسم المفعول ہے۔ نشان لگایا ہوا۔ نشان زدہ۔ واحد مؤنث۔ ﴿لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝﴾ (51/الذّٰریٰت:33-34) ''تاکہ ہم برسائیں اُن پر گارے کے بنے ہوئے پتھر (کنکر) جن پر نشان لگے ہیں آپ کے رب کی طرف سے حد سے بڑھنے والوں کے لیے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ﴿وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ﴾ (3/آل عمران:14) ''اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے۔''

س و ء

(ن) سَوْءًا ناپسندیدہ ہونا۔ برا ہونا۔ غمگین ہونا۔ بگڑ جانا۔ (لازم)۔ برا لگنا۔ کسی چیز کو بگاڑ دینا۔ غمگین کرنا۔ (متعدی)۔ ﴿وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ﴾ (11/ھود:77) ''اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوطؑ کے پاس تو وہ غمگین ہوئے اُن کے آنے سے۔'' اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''ساء لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔'' (ضیاء القران، ج۲، ص۳۸۰) ﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓئَتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (67/الملک:27) ''پھر جس وقت اُسے قریب آتے دیکھیں گے تو کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے۔'' ﴿اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ﴾ (9/التوبہ:50) ''اگر پہنچتی ہے آپؐ کو کوئی بھلائی تو وہ بری لگتی ہے ان کو۔'' ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ﴾ (17/بنی اسرائیل:7) ''پھر جب آیا دوسرے وعدے کا وقت (تو ہم نے دوسرے بندوں کو بھیج دیا) تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں/غمناک کر دیں/اداس کر دیں۔''

نوٹ: سَاءَ (بُرا ہے) اور سَاءَتْ (بری ہے) بطور فعل ذم بھی استعمال ہوتے ہیں مثلاً ﴿سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (5/المائدۃ:66) ''بہت برا ہے جو کر رہے ہیں۔'' ﴿وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝﴾ (4/النساء:97) ''اور جہنم بہت بری پلٹ کر آنے کی جگہ ہے۔''

اَسْوَءُ مؤنث: سُوْاٰی۔ افعل تفضیل ہے۔ زیادہ برا یا سب سے برا۔ ﴿لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا﴾ (39/الزمر:35) ''تاکہ اللہ دور کر دے ان سے بدترین اعمال کو جو انہوں نے کیے۔'' ﴿ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ (30/الروم:10) ''پھر ہوا انجام ان لوگوں کا جنہوں نے برا کیا، انتہائی برا، اس واسطے کہ انہوں نے جھٹلایا اللہ کی نشانیوں کو۔'' سُوْاٰی کے مقابلے پر لفظ حُسْنٰی آتا ہے۔ حُسْنٰی ہر اچھے کام کو کہتے ہیں اور سُوْاٰی ہر برے کام کو۔

سَوْءٌ صفت ہے۔ برا۔ بری۔ ﴿الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ﴾ (48/الفتح:6) ''گمان کرنے والے اللہ کے بارے میں برا گمان۔'' ﴿عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ﴾ (9/التوبۃ:98) ''(حقیقت میں) اُنہی پر ہے بری گردش۔''

سُوْءٌ اسم ذات (برائی) اور صفت (بُرا، بری) دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ﴾ (13/الرعد:18) ''یہ لوگ ہیں جن کے لیے برا حساب ہے۔'' ﴿اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ﴾ (2/البقرۃ:169) ''بے شک وہ تمہیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔''

نوٹ: سَوْءٌ (س کی زبر کے ساتھ) کا استعمال تو قرآن مجید میں صفت کے طور پر مرکب اضافی کی صورت میں ہوا ہے مثلاً دائِرَۃُ السَّوْءِ (بری گردش)، مَثَلُ السَّوْءِ (بری صفتیں) قَوْمَ سَوْءٍ (بری قوم) وغیرہ اور سُوْءٌ (س کی پیش کے ساتھ) کا استعمال قرآن مجید میں بطور صفت (برا، بری) بھی ہوا ہے اور بطور اسم ذات (برائی) بھی ہوا ہے۔ بطور صفت تو یہ لفظ اکثر مرکب اضافی کی صورت میں آیا ہے مثلاً سُوْءُ الْعَذَابِ (بُرا عذاب)، سُوْءُ الْحِسَابِ (بُرا حساب) سُوْءُ الدَّارِ (بُرا گھر) وغیرہ۔ اور بطور اسم ذات یہ لفظ فاعل، مفعول یا مرکب جاری کی صورت میں استعمال ہوا ہے اور پھر مختلف آیات میں اس کا مفہوم بھی مختلف لیا گیا ہے مثلاً کہیں یہ برائی کے معنی میں آیا۔ (البقرۃ:169)، کہیں یہ گناہ کے معنی میں آیا ہے (النساء:17)، کہیں یہ سزا اور تکلیف کے معنی میں آیا ہے (النحل:94)، کہیں یہ عیب اور بیماری کے معنی میں آیا ہے (طٰہٰ:22) اور کہیں یہ بدکاری کے معنی میں آیا ہے (یوسف:25) وغیرہ۔ (واللہ اعلم)۔

سَيِّءٌ بد۔ برا۔ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ قرآنِ مجید میں یہ لفظ سورہ فاطر کی آیت 43 میں دو مرتبہ ہی استعمال ہوا ہے۔ ﴿اِسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ﴾ ''دنیا میں اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے، اور ان کی بری تدبیروں کی وجہ سے اور بری تدبیروں کا وبال ان تدبیر والوں ہی پر پڑتا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔

سَيِّئَةٌ ج: سَيِّئَاتٌ۔ سَيِّءٌ کا مؤنث۔ ہر وہ چیز جو تکلیف اور ناگواری کا باعث بنے۔ یہ لفظ اسم ذات اور صفت دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ برائی۔ برا۔ گناہ۔ ﴿وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ﴾ (3/آل عمران:120) ''اور اگر تم لوگوں کو پہنچے کوئی برائی تو وہ لوگ خوش ہوتے ہیں اس سے۔'' ﴿وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً﴾ (4/النساء:85) ''اور جو کوئی سفارش کرتا ہے کوئی بری سفارش۔'' ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ﴾ (2/البقرۃ:81) ''کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اُس کو اُس کے گناہ نے۔'' اس کی ضد حَسَنَةٌ ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ حَسَنَةٌ اور سَيِّئَةٌ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو شرعاً اور عقلاً اچھی اور بری ہوں یعنی جن پر جزا یا سزا ملے مثلاً: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا﴾ (6/الانعام:160) ''جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی۔'' اور دوسری قسم وہ ہے جس میں طبعاً کسی شخص کو کوئی چیز اچھی یا بری لگے۔ اس معنی میں فرمایا ﴿فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ﴾ (7/الاعراف:131) ''تو جب ان کو آسائش حاصل ہوتی تو کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں اور اگر سختی پہنچتی تو موسیٰؑ اور ان کے رفیقوں کی بدشگونی بتاتے۔'' ﴿ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ﴾ (7/الاعراف:95) ''پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔'' اور مولانا مودودیؒ سورہ مومن کی آیت 9 ﴿وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ﴾ ''اور بچا دے اُن کو برائیوں سے۔'' کے تحت فرماتے ہیں: ''سیئات'' (برائیوں) کا لفظ تین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور تینوں ہی یہاں مراد ہیں ایک غلط عقائد اور بگڑے ہوئے اخلاق اور برے اعمال۔ دوسرے گمراہی اور اعمالِ بد کا وبال۔ تیسرے،

آفات اور مصائب اور اذیتیں خواہ وہ اس دنیا کی ہوں یا عالم برزخ کی، یا روزِ قیامت کی۔ فرشتوں کی دعا کا مقصود یہ ہے کہ ان کو ہر اُس چیز سے بچا جو ان کے حق میں بری ہو۔'' اور اسی آیت کے جز ﴿وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ﴾ ''جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا۔'' کے تحت لکھتے ہیں: ''روزِ قیامت کی برائیوں سے مراد میدانِ حشر کا ہول، سائے اور ہر قسم کی آسائشوں سے محرومی، محاسبے کی سختی، تمام خلائق کے سامنے زندگی کے راز فاش ہونے کی رسوائی اور دوسری وہ تمام ذلتیں اور سختیاں ہیں جن سے وہاں مجرمین کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۳۹۶)

سَوْءَةٌ اسم ذات ہے۔ ناپسندیدہ چیز۔ ہر وہ چیز جس کے اظہار کو آدمی برا سمجھے۔ اصطلاحاً یہ لفظ ستر کی چیزوں (اگر وہ کھلی ہوں) اور انسانی لاش کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ سُوْءٌ سے ہے جس کا معنی ہے ہر وہ چیز جو عقل اور شرعی لحاظ سے بری ہو یا دیکھنے میں بری معلوم ہو۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں سَوْءَةٌ کا لفظ عورت یا مرد، دونوں کی شرم گاہ پر بولا جاتا ہے جیسے فرمایا بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا اور علامہ ابن الاثیرؒ فرماتے ہیں: ''اصل میں سَوْءَةٌ کے معنی فرج (شرم گاہ) کے ہیں بعد میں اس کو ہر اس چیز کے لیے استعمال کیا جانے لگا کہ اگر ظاہر ہو تو اس سے حیاء آنے لگے خواہ وہ کوئی قول ہو یا فعل۔'' سَوْءَةٌ کا اطلاق ستر کی تمام چیزوں پر ہوتا ہے مثلاً عورت کے بدن اور چھاتی وغیرہ پر اگر وہ کھلے ہوئے ہوں۔ اور انسانی لاش کے لیے سَوْءَةٌ کا لفظ اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ اگر کچھ عرصہ دفن نہ کی جائے تو دیکھنے میں بہت بری لگتی ہے۔ ﴿كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ﴾ (5/المائدہ:31) ''کیسے وہ چھپائے اپنے بھائی کی لاش کو۔'' ﴿قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا﴾ (7/الاعراف:26) ''ہم نے اتارا ہے تم لوگوں پر لباس کو، وہ چھپاتا ہے تمہارے ستر کے حصوں کو اور آرائش ہے۔'' چنانچہ سَوْءَةٌ کا اطلاق، مرد اور عورت کی شرم گاہ پر، ستر کی تمام چیزوں پر اگر وہ کھلی ہوں، انسانی لاش پر اور ہر برے قول یا فعل پر ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

(افعال) اِسَاءَةً خراب کرنا۔ بگاڑنا۔ برائی کرنا۔ ﴿اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۫ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا﴾ (17/بنی اسرائیل:7) ''اگر تم بھلائی کرو گے تو تم بھلائی کرو گے اپنے آپ سے اور اگر تم برائی کرو گے تو اس کی سزا بھی تمہارے نفسوں کو ملے گی۔'' اوپر اَسْوَءُ کے تحت آیت نمبر (30/الروم:10) بھی دیکھ لیں۔

مُسِيْءٌ اسم الفاعل ہے۔ برائی کرنے والا۔ بدکار۔ ﴿وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ﴾ (40/المومن:58) ''اور یکساں نہیں ہے اندھا اور بینا اور (اسی طرح) مومن نیکوکار اور بدکار بھی یکساں نہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

عَذَابٌ (ع ذ ب): البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔

ذ ب ح

(ف) ذَبْحًا کسی جاندار کا گلا کاٹنا۔ ذبح کرنا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ (2/البقرہ:67) ''بے شک اللہ حکم دیتا ہے تم لوگوں کو کہ تم لوگ ذبح کرو ایک گائے۔''

ذِبْحٌ قربانی کیا ہوا جانور۔ ذبیحہ۔ ﴿وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ (37/الصافات:107) ''اور ہم نے اس کے فدیہ میں دیا ایک عظیم ذبیحہ۔''

(تفعیل) تَذْبِيْحًا کثرت سے ذبح کرنا۔ (آیتِ زیرِ مطالعہ)

اَبْنَآءٌ: البقرۃ آیت40 دیکھیں۔ یَسْتَحْیُوْنَ (ح ی ی): البقرۃ آیت26 دیکھیں۔

اِمْرَءَۃٌ اور مَرْءَۃٌ ج:نِسَاءٌ اور نِسْوَۃٌ-عورت۔عربی زبان میں نِسَاءٌ کا لفظی ترجمہ ہے عورتیں اور سیاق وسباق کے لحاظ سے اس سے مراد بیویاں، بیٹیاں، قریبی رشتہ دار عورتیں یا کسی اور قسم کی مخصوص عورتیں بھی مراد ہوتی ہیں۔

ذَالِکُمْ اسماء اشارہ میں سے ہے اشارہ بعید کے لیے آتا ہے۔اس میں ذَا اشارہ ہے اور کُمْ ضمیر جمع، خطاب کے لیے ہے جو کہ مخاطب کے لحاظ سے مذکر، مونث، تثنیہ اور جمع میں بدلتی رہتی ہے لیکن اس سے معنی میں فرق نہیں پڑتا۔

ب ل و

(س) **بَلَاءً** بوسیدہ ہونا۔زائل ہونا۔﴿قَالَ یٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا یَبْلٰی ۝۱۲۰﴾(20/طٰہٰ:120)''اس (شیطان) نے کہا اے آدمؑ کیا میں آگاہ کروں تمہیں ہمیشگی کے درخت پر اور ایسی بادشاہی پر جو کبھی زائل نہ ہو۔''

(ن) **بَلَاءً** کسی کو آزمانا۔امتحان لینا۔(یہ تکلیف اور آسودگی، دونوں طرح کی آزمائش کے لیے استعمال ہوتا ہے)۔اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمائش دو طرح سے کرتا ہے کبھی تو بندوں کو فراخی اور کشادگی دے کر آزماتا ہے کہ دیکھے وہ شکر گزاری کرتا ہے یا نہیں اور کبھی تنگی کے ذریعہ امتحان کرتا ہے کہ وہ صبر کرتا ہے یا نہیں۔چنانچہ فرمایا:﴿وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝۱۶۸﴾(7/الاعراف:168)''اور ہم نے آزمایا ان کو بھلائیوں سے اور برائیوں سے شائد کہ وہ پلٹ آئیں۔''﴿وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَیْرِ فِتْنَةً ؕ﴾(21/الانبیاء:35)''اور ہم تم کو جانچتے ہیں برائی اور بھلائی سے آزمانے کو۔''

بَلَاءٌ اسم ذات ہے۔آزمائش، خواہ خیر سے ہو یا شر سے۔امتحان۔ایسا غم جو جسم کو گھلا دے۔تکلیف۔آزمائش جب خیر سے ہو تو بَلَاءٌ کا ترجمہ عموماً ''انعام اور احسان'' سے بھی کر دیا جاتا ہے اور قرآنِ مجید میں ہمارے بزرگوں نے بَلَاءٌ کا ترجمہ دونوں طرح سے کیا بھی ہے یعنی ''آزمائش'' کے لفظ سے بھی اور ''انعام اور احسان'' کے الفاظ سے بھی۔چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ آیت زیر مطالعہ کا ترجمہ کرتے ہیں ''اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بڑی۔'' اور یہی آیت جب سورہ اعراف میں آتی ہے وہاں ترجمہ کرتے ہیں ''اور اِس میں احسان ہے تمہارے رب کا بڑا۔'' (آیت: 141)۔آیت زیر مطالعہ کے حاشیے میں حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:''بلاء کے چند معنی آتے ہیں اگر ذٰلِکُمْ کا اشارہ ذبح کی طرف لیا جائے تو اس کے معنی مصیبت کے ہوں گے اور اگر نجات کی طرف اشارہ ہے تو بلاء کے معنی نعمت کے ہوں گے اور مجموعہ کی طرف ہو تو امتحان کے معنی لیے جائیں گے۔'' (تفسیر عثمانی،ص۱۰) اسی طرح حضرت شیخ الہندؒ الانفال:17﴿وَ لِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ﴾ کا ترجمہ کرتے ہیں ''اور تا کہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان''، پیر کرم شاہ صاحبؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں ''تا کہ احسان فرمائے مومنوں پر اپنی جناب سے بہترین احسان۔'' اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں ''تا کہ آزمائش کرے ایمان والوں کی اپنی طرف سے اچھی آزمائش'' گویا ایک ہی آیت میں بلاءٌ کا ترجمہ ''احسان'' سے بھی کیا گیا ہے اور ''آزمائش'' سے بھی۔اس کی وضاحت میں پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:''علامہ زمخشری نے یبلی کا معنی یُعطی اور بلاء کا معنی عطاء کیا ہے اور صاحب تفسیر مظہری نے یبلی کا معنی ینعم اور بلاء کا معنی نعمت فرمایا ہے۔اگرچہ ابتلاء کا

لغوی معنی اختبار یعنی آزمانا ہے۔لیکن آزمائش جس طرح تکلیف ومصیبت سے کی جاتی ہے اسی طرح عطاء واحسان سے بھی کی جاتی ہے۔ اس لیے آیت کے مفہوم کے پیش نظر یہاں لفظ ابلاء کی یہ توضیح بالکل صحیح ہے۔''(ضیاء القرآن، ج۲،ص۱۳۷) اوراسی طرح الدخان:33 ﴿ وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ مِّنَ الۡاٰیٰتِ مَا فِیۡہِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیۡنٌ ﴿۳۳﴾ ﴾ کا ترجمہ مولانا عبدالماجدؒ یوں کرتے ہیں''اور ہم نے انہیں ایسی نشانیاں دی تھیں جن میں کھلا ہوا انعام تھا۔''اور حاشیے میں فرماتے ہیں ''بَلَاءٌ یہاں مصیبت کے معنی میں نہیں، اِنعام کے معنی میں ہے۔''اسی آیت کا ترجمہ پیر کرم شاہ صاحبؒ کرتے ہیں ''اور ہم نے عطا فرمائیں انہیں ایسی نشانیاں جن میں صریح آزمائش تھی۔''حضرت شیخ الہندؒ نے اس آیت میں بَلَاءٌ کا ترجمہ ''مدد'' سے کیا ہے فرماتے ہیں:''اور دیں ہم نے ان کو نشانیاں جن میں تھی مدد صریح''اس آیت کے حاشیے میں مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''بَلَاءٌ کے دو معنی آتے ہیں، ایک انعام اور دوسرے آزمائش، یہاں دونوں معنی بلا تکلف ممکن ہیں۔''(معارف القرآن، ج۷،ص۶۸۷)

بَلٰی حرف ایجاب ہے یعنی جس کے ذریعے جواب دیا جاتا ہے۔اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے''کیوں نہیں'' اور یہ ہمیشہ نفی کو اثبات بنانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے۔(1) نفی ماقبل کی تردید کے لیے مثلاً یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ ﴿ وَقَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً ﴾''اور انہوں نے کہا کہ ہم کو آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر تھوڑے دن۔'' اس دعویٰ میں نفی شامل ہے کہ آگ نہیں چھوئے گی۔ اس نفی کی تردید کے لیے آگے فرمایا ﴿ بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً ﴾ ''کیوں نہیں (ضرور چھوئے گی) بلکہ جو کوئی کمائے گا ایک برائی.....۔'' یا اسی طرح فرمایا ﴿ زَعَمَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنۡ لَّنۡ یُّبۡعَثُوۡا ؕ قُلۡ بَلٰی وَ رَبِّیۡ لَتُبۡعَثُنَّ ﴾''کافروں نے دعویٰ کیا کہ وہ ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔''اس دعویٰ میں بھی اٹھائے جانے کی نفی ہے۔اس نفی کی تردید کے لیے فرمایا۔''آپؐ کہیے کیوں نہیں (تم ضرور اٹھائے جاؤ گے) اور میرے رب کی قسم تم لازماً اٹھائے جاؤ گے۔''

(2) اس استفہام کے جواب کے طور پر آتا ہے جس استفہام میں نفی شامل ہو۔مثلاً فرمایا ﴿ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ﴾''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔'' جواب میں فرمایا بَلٰی (کیوں نہیں آپ ہی ہمارے رب ہیں) یا فرمایا ﴿ اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ﴿۳﴾ ﴾''کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم ہرگز اس کی ہڈیاں جمع نہیں کریں گے۔'' جواب میں فرمایا ﴿ بَلٰی ﴾''کیوں نہیں (ضرور کریں گے بلکہ)۔'' ﴿ قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ﴿۴﴾ ﴾''ہم تو قادر ہیں کہ اس کے پور پور درست کر دیں۔''بَلٰی اور نَعَمۡ میں فرق یہ کہ نَعَمۡ صرف استفہام کے جواب میں آتا ہے اور کلام ماقبل کی تصدیق کرتا ہے خواہ کلام مثبت ہو یا منفی۔مثلاً اگر کہا جائے هَلۡ جَاءَكَ زَيۡدٌ (کیا زید تمہارے پاس آیا) اور جواب میں کہا جائے نَعَمۡ تو مطلب ہوگا''ہاں زید آیا''اسی طرح اگر کہا جائے مَا جَاءَكَ زَيۡدٌ (زید تمہارے پاس نہیں آیا) اور جواب میں کہا جائے نَعَمۡ تو مطلب ہوگا''ہاں زید نہیں آیا''۔لیکن اگر کوئی کہے مَا عِنۡدِیۡ شَیۡءٌ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔اس کے جواب میں اگر بَلٰی کہا جائے تو اس کے دعویٰ کی نفی ہو جائے گی یعنی کیوں نہیں (تم غلط کہتے ہو) تمہارے پاس کچھ ہے اور اگر نَعَمۡ کہا جائے تو اس کی نفی کا اقرار ہو جائے گا یعنی ہاں! تم درست کہتے ہو تمہارے پاس واقعی کچھ نہیں۔قرآن مجید میں فرمایا ﴿ فَہَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ ﴾''بھلا جو وعدہ تمہارے رب نے تم سے کیا تھا تم نے اسے سچا پایا (وہ کہیں گے) ہاں۔''

(افعال) اِبْلَاءً ثلاثی مجرد کا ہم معنی ہے یعنی کسی کو آزمانا۔ امتحان لینا۔ صاحبؒ لغات القرآن کے مطابق اِبْلَاءٌ کے معنی ہیں ''نعمت دے کر کسی کو آزمانا'' ﴿وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا﴾ (8/الانفال:17) ''تاکہ آزمائش کرے ایمان والوں کی اپنی طرف سے اچھی آزمائش۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ بعض بزرگوں نے اس آیت میں يُبْلِيَ کا ترجمہ ''احسان'' سے بھی کیا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ ترجمہ کرتے ہیں: ''اور تاکہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان'' اور پیر کرم شاہ صاحبؒ ترجمہ کرتے ہیں ''تاکہ احسان فرمائے مومنوں پر اپنی جناب سے بہترین احسان۔'' اور حاشیے میں فرماتے ہیں: ''علامہ زمخشری نے یبلی کا معنی یُعطی اور بلاء کا معنی عطاء کیا ہے اور صاحب تفسیر مظہری نے یبلی کا معنی ینعم اور بلاء کا معنی نعمت فرمایا ہے۔ اگرچہ ابتلاء کا لغوی معنی اختیار یعنی آزمانا ہے۔ لیکن آزمائش جس طرح تکلیف و مصیبت سے کی جاتی ہے اسی طرح عطاء و احسان سے بھی کی جاتی ہے۔ اس لیے آیت کے مفہوم کے پیش نظر یہاں لفظ ابلاء کی یہ توضیح بالکل صحیح ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ۲، ص ۱۳۷)۔

(افتعال) اِبْتِلَاءً کسی کو آزمانا۔ آزمائش میں ڈالنا۔ امتحان لینا۔ ﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ (2/البقرہ:124) ''اور جب آزمایا ابراہیمؑ کو ان کے رب نے کچھ فرمانوں سے تو انہوں نے پورا کیا ان کو۔'' امام راغبؒ ابتلاء کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''کسی کو ابتلاء میں ڈالنے کے دو مقصد ہوتے ہیں ایک یہ کہ اس کی حالت کو جانچنا اور اس سے پوری طرح باخبر ہونا اور دوسرے یہ کہ اس کی اچھی یا بری حالت کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا۔ پھر کبھی تو ابتلاء سے یہ دونوں مفہوم مراد ہوتے ہیں اور کبھی صرف ایک ہی معنی مراد ہوتا ہے۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو صرف دوسرے معنی مراد ہوتے ہیں کیونکہ ذات باری تعالیٰ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ہے اسے کسی کی حالت سے باخبر ہونے کی ضرورت نہیں لہٰذا آیت کریمہ البقرۃ:124 میں حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش سے مقصود یہ تھا کہ ان کے کمالات کو دوسروں کے سامنے ظاہر کیا جائے۔'' اسی آیت کے تحت حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''اِبْتَلٰی۔ آزمایا اپنی واقفیت کے لیے نہیں کہ وہ تو خود علیم کل ہے، بلکہ علی الاعلان تاکہ دوسروں کو ان کے ایمان کامل کا مشاہدہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے سلسلہ میں آزمانے کا لفظ جب بھی استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے۔'' (تفسیر ماجدی، ص ۶۲)۔

مُبْتَلٍ ج: مُبْتَلُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ آزمانے والا۔ ﴿قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ﴾ (2/البقرہ:249) ''حضرت طالوت نے کہا یقیناً اللہ آزمانے والا ہے تم کو ایک نہر سے۔'' (مُبْتَلٍ جب مضاف ہو تو مُبْتَلِيْ پڑھا جاتا ہے)۔ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ﴾ (23/المومنون:30) ''بے شک اس قصے میں ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں اور ہم ضرور (اپنے بندوں کو) آزمانے والے ہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

اِبْتَلِ ج: اِبْتَلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو آزما۔ ﴿وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى﴾ (4/النساء:6) ''اور تم آزماؤ یتیموں کو۔''

رَبٌّ (ر ب ب): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ع ظ م

(ک) عَظْمَةً بڑا ہونا۔ بزرگ ہونا۔

اَعْظَمُ افعل التفضیل ہے۔ زیادہ بڑا۔ ﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا﴾ (73/المزمل:20) ''اور جو (نیکی) تم آگے بھیجو گے اپنے لیے تو اُسے اللہ کے پاس موجود پاؤ گے یہی بہتر ہے اور (اس

کا) اجر بہت بڑا ہوگا۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

عَظِیْمٌ فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بڑا (ہمیشہ اور ہر حال میں)۔ ﴿وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۰۵﴾﴾ (2/البقرہ:105) ''اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

(ن) عَظْمًا ہڈی پر مارنا۔

عَظْمٌ ج: عِظَامٌ۔ اسم ذات ہے۔ ہڈی۔ ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَھَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ﴾ (19/المریم:4) ''اس نے کہا اے میرے رب بے شک کمزور ہوئی ہڈی میری۔'' ﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَہٗ ﴿۳﴾﴾ (75/القیامہ:3) ''کیا گمان کرتا ہے انسان کہ ہم جمع نہ کر سکیں گے اس کی ہڈیوں کو۔''

(افعال) اِعْظَامًا بڑا کرنا۔ بڑا بنانا۔ ﴿وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یُکَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ وَیُعْظِمْ لَہٗٓ اَجْرًا ﴿۵﴾﴾ (65/الطلاق:5) ''اور جو اللہ کا تقویٰ کرے گا تو وہ دور کر دے گا اس سے اس کی برائیوں کو اور وہ بڑا کر دے گا اس کے لیے اجر کو۔''

(تفعیل) تَعْظِیْمًا کسی کو بڑا سمجھنا۔ کسی کا ادب و احترام کرنا۔ ﴿وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾﴾ (22/الحج:32) ''اور جو ادب و احترام کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا تو یہ (احترام) اس وجہ سے ہے کہ دلوں میں تقویٰ ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

ترکیب اِذْ سے پہلے اُذْکُرُوْا محذوف ہے۔ نَجَّیْنَا فعل، اس میں شامل ضمیر نَحْنُ اس کا فاعل ہے۔ کُمْ اس کا مفعول اور مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ متعلق فعل ہے۔ فِرْعَوْنَ، غیر منصرف ہے اس لیے حالت جر میں ایک زبر کے ساتھ آیا ہے۔ یَسُوْمُوْنَ فعل اور اس میں شامل ھُمْ کی ضمیر فاعل ہے۔ جو کہ اٰلِ فرعون کے لیے ہے۔ کُمْ اس کا مفعول اوّل اور سُوْٓءَ الْعَذَابِ مفعول ثانی ہے۔ یہ جملہ حال ہے آل فرعون کا۔ اگلے جملے یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ اور یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ پچھلے جملے یَسُوْمُوْنَکُمْ . . . کا بیان ہیں یا بدل ہیں۔ یُذَبِّحُوْنَ اور یَسْتَحْیُوْنَ دونوں کی ضمیر فاعلی بھی اٰلِ فرعون کے لیے ہیں اور اَبْنَآءَکُمْ اور نِسَآءَکُمْ دونوں مفعول ہیں۔ فِیْ ذَالِکُمْ قائم مقام خبر مقدم ہے۔ بَلَآءٌ مبتداء مؤخر نکرہ ہے۔ مِنْ رَّبِّکُمْ متعلق خبر ہے اور عَظِیْمٌ، بَلَآءٌ کی صفت ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:49

وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ	مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ	یَسُوْمُوْنَکُمْ
اور (یاد کرو) جب ہم نے نجات دی تم کو	فرعون کے پیروکاروں سے	وہ تکلیف دیتے تھے تم کو

سُوْٓءَ الْعَذَابِ	یُذَبِّحُوْنَ	اَبْنَآءَکُمْ	وَیَسْتَحْیُوْنَ
برے عذاب کی	(یعنی) وہ ذبح کرتے تھے	تمہارے بیٹوں کو	اور وہ زندہ رکھتے تھے

نِسَآءَکُمْ ط	وَفِیْ ذٰلِکُمْ	بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴿۴۹﴾
تمہاری عورتوں کو	اور اس میں تھی	تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی آزمائش

نوٹ:1 آیت میں لفظ بَلَآءٌ کے بارے میں حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں: ''بَلَآءٌ کے چند معنی آتے ہیں اگر ذٰلِکُمْ کا اشارہ ذبح کی طرف لیا جائے تو اس کے معنی مصیبت کے ہوں گے اور اگر نجات کی طرف اشارہ ہے تو بلاء کے معنی نعمت کے ہوں گے اور مجموعہ کی طرف ہو تو امتحان کے معنی لیے جائیں گے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۱۰)

نوٹ:2 مرکباتِ ناقصہ کا استعمال مختلف زبانوں میں مختلف ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں دنیا کی زندگی (مرکب اضافی)۔ جبکہ دنیوی زندگی (مرکب

توصیفی) کا اردو میں استعمال نہ ہونے جیسا ہے۔ اس کے برعکس عربی میں اَلْحَیَاۃُ الدُّنْیَا (مرکب توصیفی) استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ حَیَاۃُ الدُّنْیَا (مرکب اضافی) قران مجید میں تو استعمال نہیں ہوا۔ اس لیے مرکباتِ ناقصہ کا ترجمہ کرتے وقت متعلقہ زبان کے محاورے کا لحاظ کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اَلْحَیَاۃُ الدُّنْیَا (مرکب توصیفی) کا ترجمہ دنیا کی زندگی (مرکب اضافی) سے کیا جاتا ہے۔

اسی طرح سے آیتِ زیرِ مطالعہ سُوْٓءَ الْعَذَابِ مرکب اضافی ہے جس کا ترجمہ بنتا ہے عذاب کا برا۔ لیکن اردو میں اس کا رواج نہیں ہے۔ اس لیے صحیح مفہوم واضح کرنے کے لیے اردو محاورہ کے مطابق اس کا ترجمہ برا عذاب (مرکب توصیفی) کیا جاتا ہے۔ آگے بھی اس قسم کی مثالیں آئیں گی۔ (از لطف الرحمٰن خان صاحب)

نوٹ:3 یہاں سے مسلسل کئی رکوع تک بنواسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات اور ان کی ناشکری کے حوالے سے متعدد تاریخی واقعات کا ذکر آئے گا۔ یاد رہے کہ ان واقعات میں ترتیب زمانی ملحوظ نہیں ہے۔

آیت:50

﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۰﴾

اِذْ: البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔

ف ر ق

(ن۔ض) فَرْقًا کسی چیز کو پھاڑ کر الگ الگ کرنا۔ جدا جدا کرنا۔ ﴿فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۝۴﴾ (77/المرسلات:4) ''پھر (قسم) اُن (ہواؤں) کی جو (بادلوں کو) الگ الگ کرنے والی ہیں۔'' آیت زیر مطالعہ میں فرمایا ﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ﴾ ''اور جب ہم نے پھاڑ کر الگ کر دیا تمہارے لیے سمندر کو۔'' ﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ﴾ (17/بنی اسرائیل:106) ''اور قرآن، ہم نے جُدا جُدا کیا اس کو تا کہ آپؐ پڑھیں اس کو لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر۔'' اس آیت میں قرآن کو جدا جدا کرنے سے بعض کے نزدیک جدا جدا کر کے نازل کرنا ہے اور بعض کے نزدیک اسے سورتوں اور آیتوں کے ذریعہ سے الگ الگ کرنا ہے۔ بعض بزرگوں نے فَرَقْنَاہُ سے بَیَّنَّاہُ بھی مراد لیا ہے یعنی ہم نے اسے کھول کر صاف صاف بیان کیا ہے۔ چنانچہ امام راغبؒ فرماتے ہیں ''قُرْاٰنًا فَرَقْنَاہُ کے معنی ہیں کہ ہم نے قرآن میں تمام احکام کھول کھول کر بیان کر دیے ہیں اور بعض نے فَرَقْنَاہ کے معنی الگ الگ نازل کرنا بھی لکھے ہیں۔'' حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی دونوں باتیں لکھ دی ہیں: ''فَرَقْنٰهُ یعنی اسے سورتوں، آیتوں وغیرہ کے ذریعہ سے الگ الگ رکھا گیا ہے۔ اس کی دوسری تفسیر بَیَّنّاہ سے بھی آ گئی ہے۔ یعنی ہم نے اسے کھول کر صاف صاف بیان کیا ہے۔ یا یہ کہ اس میں حق کو باطل سے ممتاز کر دیا ہے۔''

فُرْقَانًا الگ الگ کرنا۔ حق کو باطل سے جدا کرنا۔ (لغات القرآن، مصباح اللغات)۔

(س) فَرَقًا ڈرنا۔ ڈر پوک ہونا۔ خوف کی وجہ سے اپنے اصل عقیدے کو چھپا لینا۔ ﴿وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝۵۶﴾ (9/التوبۃ:56) ''حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ ایسی قوم ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں۔''

فَارِقٌ اسم الفاعل ہے۔ واحد مذکر۔ الگ الگ کرنے والا۔

فَارِقَةٌ ج: فَارِقَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مونث۔ الگ الگ کرنے والی۔ اوپر آیت المرسلات:4 دیکھیں۔

اُفْرُقْ فعل امر ہے۔تو الگ کر۔جُدا کر۔﴿ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴾(5/المآئدۃ:25)''تو آپ جُدائی کر دیں ہم دونوں اور نافرمان قوم کے درمیان۔''

فُرْقَانٌ فُعْلَانٌ کے وزن پر اسم مبالغہ ہے۔یاد رہے کہ اسمائے مبالغہ بھی اسمائے صفت ہوتے ہیں جن میں مصدری معنی کی زیادتی سمجھی جاتی ہے۔چنانچہ فرقان بطور مصدر بھی استعمال ہوتا ہے اور بطور اسم صفت بھی۔بطور صفت اس کا مطلب ہے اَلْفَصْلُ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ۔حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی چیز۔یا اس کی تعریف یوں کی گئی ہے كُلُّ مَا فَرَقَ بِهٖ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ فَهُوَ فُرْقَانٌ۔ہر وہ چیز جس سے حق و باطل کے درمیان فرق کیا جا سکے، وہ فرقان ہے۔عربی زبان میں فَرْقٌ کا لفظ عام ہے جو کسی بھی چیز کو الگ الگ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔لیکن فرقان کا لفظ خاص طور پر حق اور باطل کو الگ الگ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔قرآنِ مجید میں یہ لفظ

(۱) قرآنِ مجید کے لیے آیا ہے۔چنانچہ فرمایا:﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ﴾(25/الفرقان:1)''نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تا کہ سارے جہان والوں کے لیے خبردار کر دینے والا ہو۔''اس آیت کے تحت مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:''فرقان مصدر ہے مادّہ ف رق سے،جس کے معنی ہیں دو چیزوں کو الگ کرنا۔یا ایک ہی چیز کے اجزاء کا الگ الگ ہونا۔قرآن مجید کے لیے اس لفظ کا استعمال یا تو فارق کے معنی میں ہوا ہے یا مفروق کے معنی میں، یا پھر اس سے مقصود مبالغہ ہے، یعنی فرق کرنے کے معاملے میں اس کا کمال اتنا بڑھا ہوا ہے کہ گویا وہ خود ہی فرق ہے۔اگر اسے پہلے اور تیسرے معنی میں لیا جائے تو اس کا صحیح ترجمہ کسوٹی،اور فیصلہ کن چیز،اور معیارِ فیصلہ(Criterion) کے ہوں گے اور اگر دوسرے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب الگ الگ اجزاء پر مشتمل،اور الگ الگ اوقات میں آنے والے اجزاء پر مشتمل چیز کے ہوں گے قرآن مجید کو ان دونوں ہی اعتبارات سے''الفرقان'' کہا گیا ہے۔''(تفہیم القرآن،ج۳،ص۴۳۲)۔

(۲) تورات کے لیے آیا ہے۔چنانچہ فرمایا:﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ ﴾(21/الانبیاء:48)''اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرقان۔''اس آیت میں فرقان سے مراد تورات ہے۔

(۳) یومِ بدر کے لیے آیا ہے:﴿ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ﴾(8/الانفال:41)''اگر تم کو یقین ہے اللہ پر اور اُس چیز پر جو ہم نے اتاری اپنے بندے پر فیصلے کے دن جس دن بھڑ گئیں دونوں فوجیں۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ) اس آیت کے تحت حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''محاورات میں فرقان اُس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو دو چیزوں میں واضح طور پر فرق اور فصل کر دے۔اسی لیے فیصلہ کو فرقان کہتے ہیں کیونکہ وہ حق اور ناحق میں فرق واضح کر دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی مدد کو بھی فرقان کہا جاتا ہے کیونکہ اُس کے ذریعہ اہلِ حق کو فتح اور اُن کے مخالف کو شکست ہو کر حق و باطل کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔قرآن کریم میں اسی معنی کے لیے غزوۂ بدر کو یوم الفرقان کے نام سے موسوم کیا ہے۔''(معارف القرآن،ج۴،ص۲۱۸)

(۴) معجزات کے لیے آیا ہے:﴿ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾(2/البقرۃ:53)''اور جب عطا فرمائی ہم نے موسیٰؑ کو کتاب اور فرقان تا کہ تم ہدایت پاؤ۔''اس آیت میں اکثر بزرگوں نے فرقان سے معجزات مراد لیے ہیں۔(واللہ اعلم)۔

(۵) باطنی نور اور بصیرت کے لیے آیا ہے۔چنانچہ فرمایا:﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا

وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ﴾(8/الانفال:29)''اے ایمان والو اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو وہ پیدا کردے گا تم میں حق وباطل میں تمیز کی قوت اور ڈھانپ دے گا تم سے تمہارے گناہ اور بخش دے گا تمہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔اس آیت کے تحت حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''فرقان سے مراد اس آیت میں وہ عقل وبصیرت ہے جس کے ذریعہ حق وباطل، کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنا سہل ہو جائے۔'' (معارف القرآن، ج ۴، ص ۲۱۸)۔

فَرِيْقٌ فَعِيْلٌ کا وزن ہے۔(۱) کسی جماعت سے الگ ہونے والا گروہ۔فریق۔﴿وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾(2/البقرہ:75)''اور اس میں سے ایک گروہ ہے جو سنتا ہے اللہ کے کلام کو۔'' (۲) کسی چیز کے جزء یا حصے کو بھی فریق کہتے ہیں۔﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾(2/البقرۃ:188)''اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طریقے سے اور نہ رسائی حاصل کرو اس مال سے (رشوت دے کر) حاکموں تک تاکہ یوں کھاؤ کچھ حصہ لوگوں کے مال کا ظلم سے حالانکہ تم جانتے ہو (کہ اللہ نے یہ حرام کیا ہے)۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:''فریق کا معنی گروہ بھی ہے اور کسی چیز کے حصہ اور جزء کو بھی فریق کہتے ہیں۔یہاں یہی معنی مراد ہے۔''

فِرْقَةٌ کسی جماعت سے الگ ہونے والی ٹکڑی۔فرقہ۔﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ﴾(9/التوبہ:122)''اور کیوں نہ نکلا ان سب میں سے ایک گروہ تاکہ وہ سمجھ حاصل کریں دین میں اور تاکہ وہ خبردار کریں اپنی قوم کو۔'' نوٹ: فَرِيْقٌ اور فِرْقَةٌ میں فرق یہ ہے کہ فَرِيْقٌ بڑے گروہ کو کہتے ہیں اور فِرْقَةٌ چھوٹے گروہ کو۔(لغات القرآن، ج۵، ص ۴۵)

فِرْقٌ اسم ذات ہے۔کسی چیز کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا۔﴿فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴾(26/الشعراء:63)''پس وہ پھٹا تو ہر ٹکڑا تھا بڑے تودے کی مانند۔''

(تفعیل) **تَفْرِيْقًا** (۱) جُدائی ڈالنا۔(۲) الگ الگ کرنا۔(۳) فرق کرنا۔﴿اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾(20/طٰہٰ:94)''مجھے خوف ہوا کہ تو کہے گا کہ تو نے جُدائی ڈالی اسرائیل کے بیٹوں کے درمیان۔''﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ﴾(6/الانعام:159)''بے شک جن لوگوں نے الگ الگ کیا اپنے دین کو یعنی جُدا جُدا راہیں نکالیں۔''﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾(2/البقرہ:285)''ہم فرق نہیں کرتے اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے مابین۔''

(مفاعلہ) **مُفَارَقَةً اور فِرَاقًا** ایک دوسرے سے جُدا ہونا اور جدا کرنا۔﴿هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ﴾(18/الکہف:78)''یہ جُدا ہونا ہے میرا اور آپ کا۔''

فَارِقْ ج: فَارِقُوْا۔فعل امر ہے۔تو جُدا ہو۔﴿فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾(65/الطلاق:2)''تو تم لوگ تھامے رہو ان کو بھلائی سے یا تم لوگ جُدا ہو ان سے بھلائی کے ساتھ۔''

(تفعّل) **تَفَرُّقًا** الگ الگ ہونا۔﴿وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ﴾(42/الشوریٰ:14)''اور وہ الگ الگ نہیں ہوئے مگر اس کے بعد کہ جو علم آیا ان کے پاس، باہم حسد کرتے ہوئے۔''

مُتَفَرِّقٌ ج: مُتَفَرِّقُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ الگ الگ ہونے والا۔الگ الگ۔ ﴿وَادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ﴾ (12/یوسف:67)''اور تم داخل ہو الگ الگ دروازوں سے۔'' ﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ

اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَہَّارُ ﴿۳۹﴾ (12/یوسف:39) ''اے قید خانے کے میرے دونوں رفیقو! یہ تو بتاؤ کیا بہت سے جدا جدا رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔''

ب ح ر

(ف) **بَحْرًا** چیرنا۔ پھاڑنا۔ جیسے زمین کو گہرا کرنا یا اونٹ کا کان چیرنا۔

بَحْرٌ ج: **اَبْحُرٌ** اور **بِحَارٌ**- زمین کا نشیب جہاں پانی جمع ہو۔ سمندر۔ دریا۔ ﴿وَ الۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ﴾ (2/البقرہ:164) ''اور کشتی جو چلتی ہے دریا میں۔'' ﴿مِنۡۢ بَعۡدِہٖ سَبۡعَۃُ اَبۡحُرٍ﴾ (31/لقمان:27) ''اس کے پیچھے سات سمندر ہوں۔'' ﴿وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۙ﴿۳﴾﴾ (82/الانفطار:3) ''اور جب سمندر بہائے جائیں گے۔''

بَحِیۡرَۃٌ ''جس جانور کا دودھ بتوں کے نام کر دیتے تھے کوئی اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔'' (تفسیر عثمانی، ص ۱۶۵)۔ ''اس کا لغوی معنی ہے کان چرا۔ وہ اونٹنی جو پانچ بچے جنتی اور آخری بچہ نر ہوتا تو کان چیر کر اُسے چھوڑ دیتے۔ اس پر سواری کرنا، اس کا گوشت سب اپنے اُوپر حرام خیال کر لیتے۔'' (ضیاء القرآن، ج۱، ص ۵۱۵)۔ ﴿وَمَا جَعَلَ اللّٰہُ مِنۡۢ بَحِیۡرَۃٍ﴾ (5/المآئدۃ:103) ''اور اللہ نے مقرر نہیں کیا کوئی بھی بحیرہ۔''

اَنۡجَیۡنَا (ن ج و): البقرۃ آیت 49 دیکھیں۔

غ ر ق

(س۔ن) **غَرۡقًا** اور **غَرَقًا** پانی کی تہہ میں چلے جانا۔ ڈوب جانا۔ غوطہ لگانا۔ ﴿حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ۙ﴿۹۰﴾﴾ (10/یونس:90) ''یہاں تک کہ جب آ لیا اس کو ڈوبنے نے یعنی جب وہ ڈوبنے لگا۔'' ﴿وَ النّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ﴿۱﴾﴾ (79/النازعات:1) ''قسم ہے (فرشتوں کی) جو غوطہ لگا کر (جان) کھینچنے والے ہیں۔'' اس آیت کے تحت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''غرق اور اغراق کے معنی کسی کام میں پوری قوت خرچ کرنے کے بھی ہیں۔ محاورہ میں کہا جاتا ہے۔ اغرق النّازع فی القوس یعنی کمان کھینچنے والے نے اس کے کھینچنے میں اپنی پوری قوت خرچ کر دی۔'' (معارف القرآن، ج۸، ص ۶۶۳)۔ چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: ''قسم ہے اُن فرشتوں کی جو (کافروں کی) جان سختی سے نکالتے ہیں۔''

(افعال) **اِغۡرَاقًا** کسی کو ڈبو دینا۔ ﴿وَ اَغۡرَقۡنَا الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ؕ﴾ (7/الاعراف:64) ''اور ہم نے ڈبو دیا ان لوگوں کو جنہوں نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو۔''

مُغۡرَقٌ ج: **مُغۡرَقُوۡنَ**- اسم المفعول ہے۔ جس کو ڈبویا جائے۔ ڈبویا ہوا۔ ﴿وَ لَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّہُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ ﴿۳۷﴾﴾ (11/ھود:37) ''اور آپؑ خطاب نہ کریں مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا یقیناً وہ لوگ ڈبوئے جانے والے ہیں۔''

اٰلٌ: البقرۃ آیت 41 دیکھیں۔ **فِرۡعَوۡنُ**: البقرۃ آیت 49 دیکھیں۔

ن ظ ر

(ن) **نَظَرًا، نَظۡرًا** کسی کی طرف نگاہ کر کے اپنی نظر یا فکر کو متحرک کرنا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) کسی طرف محض دیکھنا۔ (۲) صورتحال کو سمجھنے کے لیے دیکھنا۔ (۳) غور و فکر کرنا۔ (۴) دوسرے کے حالات سمجھنے

کے لیے دیکھنا۔ رعایت کرنا۔ (۵) انتظار کرنا۔ عام طور پر انتظار کرنے کا مفہوم باب افتعال میں ہے لیکن ان معنوں میں باب (ن) سے بھی آجاتا ہے۔﴿ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ﴾(9/التوبہ:127) ''اور جب بھی کوئی صورت اتاری جاتی ہے تو ان میں سے کچھ دیکھتے ہیں کچھ کی طرف۔'' ﴿ قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾(27/النمل:27) ''انہوں نے کہا میں دیکھوں گا آیا تو نے سچ کہا یا تو ہے جھوٹ بولنے والوں میں سے۔'' ﴿ اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾(7/الاعراف:185) ''تو کیا ان لوگوں نے غور وفکر نہیں کیا زمین اور آسمانوں کی بادشاہت میں۔'' ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ﴾(2/البقرۃ:210) ''کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آئے اُن کے پاس اللہ کا عذاب چھائے ہوئے بادلوں کی صورت میں اور فرشتے اور اُن کا فیصلہ ہی کر دیا جائے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

اُنْظُرْ ج: اُنْظُرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو دیکھ۔﴿ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ﴾(30/الروم:50) ''پس تو غور کر اللہ کی رحمت کے آثار کی طرف کیسے وہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کی موت کے بعد۔'' ﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ﴾(2/البقرہ:104) ''اور تم لوگ مت کہو راعنا اور کہو آپؐ رعایت کریں ہماری اور سنو۔'' ﴿ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا ﴾(57/الحدید:113) ''اور اُس روز کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے اے نیک بختو ذرا ہمارا بھی انتظار کرو۔''

نَاظِرٌ ج: نَاظِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ دیکھنے والا۔﴿ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴾(2/البقرہ:69) ''شوخ ہے اس کا رنگ وہ یعنی گائے خوش کرتی ہے دیکھنے والوں کو۔''

نَاظِرَةٌ اسم الفاعل ہے۔ دیکھنے والی۔﴿ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾(27/النمل:35) ''تو میں دیکھنے والی ہوں کہ کس چیز کے ساتھ واپس ہوتے ہیں بھیجے ہوئے لوگ۔''

نَظْرَةٌ اسم ذات ہے۔ ایک نگاہ۔ ایک نظر۔﴿ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴾(37/الصافات:88) ''تو اس نے دیکھا ایک نظر ستاروں کو۔''

(افعال) اِنْظَارًا کسی کو مہلت دینا۔﴿ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴾(7/الاعراف:195) ''پھر تم لوگ داؤ چلاؤ مجھ پر اور مہلت نہ دو مجھ کو۔''

نَظِرَةٌ اسم ذات ہے۔ رعایت۔ مہلت۔﴿ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ﴾(2/البقرہ:280) ''اور اگر وہ ہے تنگی والا تو مہلت ہے آسانی تک۔''

اَنْظِرْ فعل امر ہے۔ تو مہلت دے۔﴿ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴾(7/الاعراف:14) ''اس نے کہا تو مہلت دے مجھ کو ان لوگوں کو دوبارہ اٹھائے جانے کے دن تک۔''

مُنْظَرٌ ج: مُنْظَرُوْنَ۔ اسم المفعول ہے۔ مہلت دیا ہوا یعنی جس کو مہلت دی گئی۔﴿ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴾(7/الاعراف:15) ''فرمایا بے شک تو مہلت دیئے ہوئے لوگوں میں سے ہے۔''

(افتعال) اِنْتِظَارٌ راہ دیکھنا۔ انتظار کرنا۔﴿ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ﴾(33/الاحزاب:23) ''تو ان میں ہیں وہ، جنہوں نے پورا کیا اپنی منت کو اور ان میں ہیں وہ، جو راہ دیکھتے ہیں۔''

اِنْتَظِرْ ج:اِنْتَظِرُوْا۔ فعل امر ہے۔تو انتظار کر۔﴿ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ﴾(32/السجدۃ:30) ''پس اے حبیبؐ رخ انور پھیر لیجئے اُن سے اور انتظار فرمایئے وہ بھی منتظر ہیں۔'' ﴿ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾ ﴾ (10/یونس:20) ''تو تم لوگ انتظار کرو بے شک میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔''

مُنْتَظِرٌ ج:مُنْتَظِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔راہ دیکھنے والا۔انتظار کرنے والا۔اوپر آیت (10/یونس:20) دیکھیں۔

ترکیب 'وَ' حرف عطف ہے اور اِذْ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے اُذْکُرُوْا محذوف ہے۔ فَرَقْنَا فعل ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحْنُ ہے۔ بِكُمْ متعلق فعل ہے اور اَلْبَحْرَ مفعول ہے۔ بِكُمْ میں 'بِ' بمعنی 'لِ' ہے یعنی فَرَقْنَا لَكُمْ، مطلب ہے تمہارے لیے یا 'بِ' سببیہ ہے یعنی تمہاری وجہ سے۔ 'فَ' حرف عطف ہے۔ اَنْجَيْنَا فعل اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل ہے اور كُمْ مفعول ہے۔ اسی طرح آگے 'وَ' عطف کا ہے، اَغْرَقْنَآ فعل اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل اور اٰلَ فِرْعَوْنَ مفعول ہے، اسی لیے اٰلَ حالت نصب میں ہے۔ آگے 'وَ' حالیہ ہے، اَنْتُمْ مبتدا اور جملہ فعلیہ تَنْظُرُوْنَ اس کی خبر۔ یہ جملہ اسمیہ حال ہے فَاَنْجَيْنٰكُمْ میں كُمْ ضمیر کا۔

ترجمہ
البقرۃ:50

وَاِذْ	فَرَقْنَا	بِكُمُ	الْبَحْرَ	فَاَنْجَيْنٰكُمْ
اور (یاد کرو) جب	ہم نے پھاڑ کر الگ کیا	تمہارے لیے یا تمہاری وجہ سے	سمندر کو	پھر ہم نے نجات دی تم کو

وَاَغْرَقْنَآ	اٰلَ فِرْعَوْنَ	وَ	اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾
اور ہم نے ڈبو دیا	فرعون کے پیروکاروں کو	اس حال میں کہ	تم لوگ دیکھ رہے تھے

آیت:51

﴿ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ﴾

نوٹ گزشتہ آیات میں قرآنی الفاظ اور ان کے مادوں کے حوالے اکٹھے دیے گئے تھے۔لیکن آیت زیر مطالعہ سے الفاظ کے صرف مادے دیے جائیں گے کیونکہ قرآنِ مجید کے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ لفظ دیکھ کر اس کے مادے کو پہچانے۔

اِذْ البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔

و ع د

(ض) (ل) وَعْدًا، مَوْعِدًا، مِيْعَادًا وعدہ کرنا۔﴿ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ ﴾(36/یٰسٓ:52) ''یہ ہے وہ جو وعدہ کیا رحمٰن نے اور سچ کہا بھیجے ہوؤں نے یعنی رسولوں نے۔''

عِدْ فعل امر ہے۔تو وعدہ کر۔﴿ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ ﴾(17/بنی اسرائیل:64) ''اور تو حصہ دار بن ان کے مال اور اولاد میں اور تو وعدہ کر ان سے۔''

مَوْعُوْدٌ اسم المفعول ہے۔جس کا وعدہ کیا گیا۔﴿ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ﴿۲﴾ ﴾(85/البروج:2) ''اور جس دن کا وعدہ کیا گیا ہے۔''

وَعْدٌ مصدر کے علاوہ بطور اسم ذات بھی استعمال ہوتا ہے۔ وعدہ۔ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ (10/یونس:48) ''اور وہ لوگ کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم لوگ سچے ہو۔''

نوٹ: وعدہ اور عہد میں فرق یہ ہے کہ وعدہ یک طرفہ ہوتا ہے اور عہد اس قول کا نام ہے جو دو طرفہ یعنی فریقین کے درمیان باہمی بات چیت سے طے ہوتا ہے جس پر دونوں کو قائم رہنا ضروری ہوتا ہے۔

مَوْعِدٌ مَفْعِلٌ کا وزن ہے۔ یہ لفظ مندرجہ ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (1) مصدر میمی بمعنی وعدہ کرنا۔ (2) اسم ظرف بمعنی وعدے کا وقت یا جگہ۔ ﴿فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ﴾ (20/طٰہٰ:58) ''پس تو مقرر کر ہمارے اور اپنے درمیان وعدے کا وقت جس کے ہم خلاف نہ کریں۔'' ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ﴾ (11/ھود:17) ''اور جو کفر کرے گا اُس کے ساتھ مختلف گروہوں میں سے تو آتش جہنم ہی اُس کے وعدے کی جگہ ہے۔'' (3) اسم ذات بمعنی وعدہ۔ ﴿وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ﴾ (20/طٰہٰ:97) ''بے شک تیرے لیے ایک اور وعدہ (عذاب) بھی ہے جس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔'' ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ﴾ (9/التوبۃ:114) ''اور نہیں تھا حضرت ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت مانگنا مگر صرف اس وعدے کی وجہ سے جس کا وعدہ انہوں نے اپنے باپ سے کیا تھا۔''

مِيْعَادٌ یہ لفظ بھی مصدر کے علاوہ 'وعدہ' اور 'وعدے کا مقرر وقت' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝﴾ (3/آل عمران:9) ''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پھرتا اپنے وعدے سے۔'' ﴿وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ﴾ (8/الانفال:42) ''اور اگر تم لڑائی کے لیے وقت مقرر کرتے تو ضرور اختلاف کرتے وقت مقرر کے بارے میں۔'' ﴿قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ۝﴾ (34/سبا:30) ''فرمایئے اے منکرو! تمہارے لیے وعدے کا دن مقرر ہے نہ تم اس سے ایک لمحہ پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ ایک لمحہ آگے بڑھ سکو گے۔''

(ب) وَعِيْدًا ڈرانا۔ دھمکانا۔ ﴿اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ (2/البقرۃ:268) ''شیطان تمہیں فقیری سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔'' ﴿فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾ (7/الاعراف:70) ''پس تم جس چیز سے ہمیں ڈراتے ہو اسے لے آؤ اگر تم سچوں میں سے ہو۔''

وَعِيْدٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ عذاب کا وعدہ۔ دھمکی۔ ڈراوا۔ ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝﴾ (50/قٓ:45) ''پس آپؐ یاددہانی کرائیں قرآن کے ذریعے اس کو جو ڈرتا ہے میری دھمکی سے۔'' ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۝﴾ (50/قٓ:20) ''یہ ہے دن ڈرانے کا۔''

(افعال) اِيْعَادًا کسی کو دھمکی دینا۔ ڈرانا۔ ﴿وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ﴾ (7/الاعراف:86) ''اور تم لوگ مت بیٹھو ہر ایسے راستے پر جہاں تم لوگ ڈراتے ہو۔''

(مفاعلہ) مُوَاعَدَةً ایک دوسرے سے وعدہ کرنا۔ ﴿وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا﴾ (2/البقرہ:235) ''اور لیکن تم لوگ خواتین سے باہمی وعدہ مت کرو خفیہ طور پر۔'' عموماً مفاعلہ میں مشارکہ ہوتا ہے لیکن عربی میں یہ لفظ یک طرفہ وعدے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ﴿وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً﴾ (7/الاعراف:142) ''اور ہم نے وعدہ کیا موسیٰؑ سے تیس رات کا۔''

(تفاعل) تَوَاعُدًا ایک دوسرے سے وعدہ کرنا۔ ﴿وَ لَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ﴾ (8/الانفال:42) ''اور اگر تم لڑائی کے لیے وقت مقرر کرتے تو ضرور اختلاف کرتے وقت مقرر کے بارے میں۔''

ل ی ل

(x) x ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوتا۔

لَیْلٌ اسم جنس ہے۔اس کی جمع لَیَالٍ اور واحد لَیْلَۃٌ ہے۔رات۔ ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۟﴾ (97/القدر:1) ''بیشک ہم نے نازل کیا اس کو قدر کی رات میں۔'' ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ (17/بنی اسرائیل:1) ''پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔'' لَیْلٌ پر جب 'ال' داخل ہو تو ایک ل کے ساتھ اَللَّیْلُ لکھا جاتا ہے۔ ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ﴾ (6/الانعام:76) ''پھر جب چھا گئی اُن پر رات تو اُنہوں نے ایک ستارہ دیکھا۔'' لَیَالٍ اصل میں لَیَالِیٌ ہے جو قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر لَیَالٍ لکھا جاتا ہے۔ ﴿اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ۝﴾ (19/مریم:10) ''تیری نشانی ہے کہ تو کلام نہیں کرے گا لوگوں سے تین راتیں مکمل۔''

ع خ ذ: البقرۃ آیت 48 دیکھیں۔

ع ج ل

(س) عَجَلًا، عُجْلَةً کسی چیز کو وقت سے پہلے حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ جلد بازی کرنا۔ ﴿وَ عَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی ۝﴾ (20/طٰہٰ:84) ''اور میں نے جلدی کی تیری طرف اے میرے رب تاکہ تو راضی ہو۔'' ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝﴾ (75/القیامہ:16) ''آپؐ حرکت نہ دیں قرآن کے لیے، اپنی زبان کو تاکہ آپؐ جلدی کریں قرآن پڑھنے میں۔''

عَاجِلَةٌ اسم الفاعل ہے۔ واحد مؤنث کا صیغہ۔ بطور صفت استعمال ہوتا ہے۔ جلدی ملنے والی۔ پھر اس مفہوم میں یہ لفظ دنیا اور اس کے ساز و سامان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''عاجلہ کے لغوی معنی ہیں جلدی ملنے والی چیز۔ اور اصطلاحاً قرآن مجید اس لفظ کو دنیا کے لیے استعمال کرتا ہے جس کے فائدے اور نتائج اِسی زندگی میں حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے کی اصطلاح ''آخرت'' ہے جس کے فوائد اور نتائج کو موت کے بعد دوسری زندگی تک مؤخر کر دیا گیا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۶۰۷) ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝﴾ (75/القیامہ:20) ''ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ محبت کرتے ہو دنیا سے۔''

عَجُوْلٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت جلد باز۔ ﴿وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝﴾ (17/بنی اسرائیل:11) ''اور انسان بڑا جلد باز ہے۔''

عَجَلٌ اسم ذات ہے۔ جلدی۔ جلد بازی۔ ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ﴾ (21/الانبیاء:37) ''پیدا کیا گیا انسان کو جلد بازی سے۔'' یعنی جلد بازی انسان کی جبلت میں ودیعت کی گئی ہے۔

عِجْلٌ — گائے کا بچھڑا، کیونکہ اس میں بڑی تیزی اور پھرتی پائی جاتی ہے جو بیل بننے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔﴿ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴾(51/الذریات:26)''پس وہ گیا اپنے گھر والوں کی طرف پھر وہ لایا ایک موٹا بچھڑا۔''

(افعال) اِعْجَالًا — جلدی کرانا۔ جلدی کرنا۔﴿ وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴾(20/طٰہٰ:83)''اور کس چیز نے جلدی کرائی آپؑ کو اپنی قوم سے اے موسیٰؑ۔''

(تفعیل) تَعْجِيْلًا — جلدی دینا۔ جلدی کرنا۔﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ﴾ (17/بنی اسرائیل:18)''جو لوگ طلب گار ہیں صرف دنیا کے ہم جلدی دے دیتے ہیں اُس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں اُن میں سے جسے چاہتے ہیں پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اُس کے لیے جہنم۔''

عَجِّلْ — فعل امر ہے۔ تو جلدی دے۔ تو جلدی کر۔﴿ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴾(38/صٓ:16) ''اور مذاقاً کہتے ہیں اے ہمارے رب جلدی دے دے ہمارے حصے کا عذاب یوم حساب سے پہلے۔''

(تفعّل) تَعَجُّلًا — جلدی کرنا۔﴿ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ﴾(2/البقرہ:203)''تو جس نے جلدی کی دو دنوں میں تو کوئی گناہ نہیں ہے اس پر۔''

(استفعال) اِسْتِعْجَالًا — وقت سے پہلے مانگنا۔ جلدی مچانا۔﴿ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ﴾(42/الشوریٰ:18)''جلدی مچاتے ہیں اس کے لیے یعنی قیامت کے لیے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے اس پر۔''

ظ ل م: البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔

ترکیب

'وَ' عطف کا ہے۔ اِذْ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے اُذْكُرُوْا محذوف ہے۔ وٰعَدْنَا باب مفاعلہ سے ماضی کا جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل نَحْنُ کی ضمیر ہے۔ اس کے دو مفعول ہوتے ہیں کس سے وعدہ کیا اور کیا وعدہ کیا۔ مُوْسٰی اس کا پہلا مفعول ہے اور اَرْبَعِيْنَ دوسرا مفعول ہونے کی وجہ سے نصب میں ہے۔ جبکہ لَيْلَةً تمیز ہونے کی وجہ سے نصب میں ہے۔ اَرْبَعِيْنَ کو اگر ظرف مانیں تب یہ متعلق فعل ہوگا یعنی وٰعَدْنَا سے متعلق ہوگا اور معنی ہو جائیں گے ہم نے حضرت موسیٰؑ سے چالیس راتوں میں وعدہ کیا جو کہ صحیح نہیں۔ آگے ثُمَّ حرف عطف ہے اور اِتَّخَذْتُمْ ماضی کا جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر ہے۔ اِتَّخَذَ بھی عموماً دو مفعول کا تقاضہ کرتا ہے۔ کس کو بنایا؟ اور کیا بنایا؟ اس آیت میں اِتَّخَذَ کا پہلا مفعول اَلْعِجْلَ ہے جبکہ دوسرا مفعول اِلٰهًا محذوف ہے۔ مِنْ بَعْدِهٖ میں 'ہٖ' ضمیر حضرت موسیٰؑ کے لیے ہے یعنی 'ان کے جانے کے بعد'۔ آگے 'وَ' حالیہ ہے۔ اَنْتُمْ مبتدا اور ظٰلِمُوْنَ خبر ہے۔ یہ جملہ اسمیہ، حال ہے اِتَّخَذْتُمْ کی ضمیر فاعلی کا۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ — البقرۃ:51

وَاِذْ وٰعَدْنَا	مُوْسٰى	اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً	ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ
اور (یاد کرو) جب ہم نے وعدہ کیا	حضرت موسیٰؑ سے	چالیس راتوں کا	پھر تم نے بنایا

الْعِجْلَ	مِنْۢ بَعْدِهٖ	وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٥١﴾
بچھڑے کو (معبود)	اس (حضرت موسیٰؑ) کے (جانے کے) بعد	اور تم ظلم کرنے والے تھے

آیت:52

﴿ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ ﴾

ع	ف	و

(ن) **عَفْوًا** اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کا نشان مٹا دینا۔ پھر یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً (۱) معاف کرنا۔ اپنا حق چھوڑ دینا۔ ﴿ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ﴾ (2/البقرہ:237) ''سوائے اس کے کہ وہ خواتین معاف کر دیں یا وہ معاف کرے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔'' ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ﴾ (42/الشوریٰ:40) ''اور برائی کا بدلہ اسی جیسی ایک برائی ہے۔ تو جس نے معاف کیا اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔''

(۲) جو شخص سزا کا مستحق ہو اسے چھوڑ دینا، اس کے قصور کا بدلہ نہ لینا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا کسی سے درگزر کرتے ہوئے اس کے گناہوں کو مٹا دینا۔ اِن معنوں میں عموماً عَنْ کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ ﴾ (2/البقرہ:187) ''اور اس نے تم سے درگزر کیا۔'' ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ ﴾ (42/الشوریٰ:25) ''اور وہ ہے جو قبول کرتا ہے توبہ کو اپنے بندوں سے اور وہ درگزر کرتا ہے برائیوں سے۔''

(۳) کسی چیز کو بڑھانا۔ زیادہ کرنا۔ اسی معنی میں ارشادِ نبویؐ ہے: قَصُّوا الشَّوَارِبَ وَاَعْفُوا اللُّحٰی اپنی مونچھوں کو کترواؤ اور داڑھیوں کو بڑھاؤ یا زیادہ کرو۔

(۴) بڑھنا۔ زیادہ ہونا۔ (لازم)۔ جو چیز زیادہ اور گھنی ہو جائے تو عربی میں بولتے ہیں عَفَا الشَّیْءُ۔ ﴿ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا ﴾ (7/الاعراف:95) ''پھر ہم نے بدل دیا برائی کی جگہ کو بھلائی سے یہاں تک کہ وہ لوگ زیادہ ہو گئے (مال اور اولاد میں)۔'' اس آیت میں عَفَوْا بمعنی کَثُرُوْا (زیادہ ہونا) ہے۔

اُعْفُ ج: اُعْفُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو معاف کر یا درگزر کر۔ ﴿ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ﴾ (2/البقرہ:286) ''اور تو درگزر فرما ہم سے اور تو بخش دے ہم کو اور تو رحم کر ہم پر۔'' ﴿ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ﴾ (2/البقرہ:109) ''پس تم معاف کرو اور چھوڑ دو یہاں تک کہ اللہ بھیج دے اپنا حکم۔''

عَافِ ج: عَافُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ معاف کرنے والا۔ درگزر کرنے والا۔ ﴿ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ﴾ (3/آل عمران:134) ''اور ضبط کرنے والے غصے کو اور درگزر کرنے والے لوگوں سے۔''

عَفُوٌّ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت زیادہ معاف کرنے والا۔ یوں معاف کرنے والا کہ گناہ کا نام و نشان تک نہ رہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾ ﴾ (4/النساء:43) ''یقیناً اللہ بے انتہا معاف کرنے والا، بے انتہا بخشنے والا ہے۔'' شب قدر میں جو دعا مانگی جاتی ہے اُس میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ۔ اے اللہ بے شک تو بہت معاف کرنے والا ہے اور تو معافی کو پسند کرتا ہے پس تو مجھ سے درگزر کر۔''

عَفْوٌ (۱) معافی۔ درگزر۔ (۲) بڑھی ہوئی یعنی اضافی چیز۔ ضرورت سے زائد چیز۔ ﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ ﴾

(7/الاعراف:199)''آپؐ پکڑیں یعنی اپنائیں درگزر کو اور ترغیب دیں بھلائی کی۔''﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۙ قُلِ الْعَفْوَ ؕ﴾(2/البقرہ:219)''اور یہ لوگ پوچھتے ہیں آپؐ سے کہ کتنا خرچ کریں، آپؐ کہیے کہ اضافی چیز کو۔''اس آیت میں اَلْعَفْوَ سے مراد ہے مَاسَهُلَ وَتَيَسَّرَ وَلَمْ يَشُقَّ عَلَى الْقَلْبِ۔ جو آسان اور سہولت سے ہو اور دل پر گراں نہ گزرے۔

لَعَلَّ: البقرۃ آیت 21 دیکھیں۔

ش ك ر

(ن) شُكْرًا اور شُكُوْرًا کسی نعمت کا اعتراف کرنا اور احسان ماننا۔شکر ادا کرنا۔تین چیزوں کے مجموعے کا نام شکر ادا کرنا ہے۔ایک یہ کہ آدمی دل سے محسن کے انعامات اور احسانات کا اعتراف کرے۔دوسرے یہ کہ زبان سے اس کا اقرار کرے اور تیسرے یہ کہ عمل سے اِن انعامات اور احسانات کا ثبوت دے۔شکر کی ضد کفر ہے۔کفر جب شکر کے مقابلے میں استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کسی کے انعامات اور احسانات کو چھپا دینا اور بھلا دینا اور اس کا ترجمہ 'ناشکری' سے کیا جاتا ہے۔اللہ کا شکر ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دل سے اللہ تعالیٰ کے انعامات اور احسانات کا اعتراف کرے، دوسرے یہ کہ زبان سے بھی کلمہ شکر ادا کرے اور تیسرے یہ کہ توحید، اسلام اور ایمان کے تقاضوں کو پورا کرے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ ہی کے کاموں میں لگا دے۔اللہ کی ناشکری کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نہ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا اعتراف کرے، نہ زبان سے کلمہ شکر ادا کرے اور ان نعمتوں کو اللہ کی نافرمانی میں صرف کر دے۔﴿وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ﴾(27/النمل:40)''اور جو شکر ادا کرتا ہے تو بے شک وہ شکر ادا کرتا ہے اپنے آپ ہی کے لیے۔''﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ﴾(34/سبا:13)''کام کرو اے داؤد کے گھر والو احسان مان کر۔''﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝﴾(25/الفرقان:62)''اور وہ وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنا دیا اُس شخص کے لیے جو سمجھنا چاہے یا شکر ادا کرنا چاہے۔''

اُشْكُرْ ج: اُشْكُرُوْا۔فعل امر ہے۔تو احسان مان۔تو شکر ادا کر۔﴿اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ﴾(31/لقمان:14)''کہ تو احسان مان میرا اور اپنے والدین کا۔''﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝﴾(2/البقرۃ:152)''سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا اور شکر ادا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کیا کرو۔''

شَاكِرٌ ج: شَاكِرُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔اس کی نسبت جب بندے کی طرف ہو تو مطلب ہوتا ہے شکر ادا کرنے والا اور جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مطلب ہوتا ہے قدر دان، اعتراف خدمت کرنے والا اور بندے کی تھوڑی سی اطاعت پر بہت زیادہ اجر دینے والا۔﴿شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ﴾(16/النحل:121)''شکر کرنے والا اس کے احسانوں کا۔''﴿فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝﴾(2/البقرۃ:158)''سو اللہ تو بڑا قدر دان ہے بڑا علم رکھنے والا ہے۔''اس آیت کے تحت صاحبؒ تفسیر ماجدی فرماتے ہیں:''شکر کا لفظ جب اللہ کے لیے آتا ہے تو اُس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ بندہ کی تھوڑی سی اطاعت پر معاوضہ بہت زائد دیتا ہے۔''(تفسیر ماجدی،ص ۷۷)۔﴿فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝﴾(21/الانبیاء:80)''پھر کیا تم شکر گزار بنو گے۔''

مَشْكُوْرٌ اسم المفعول ہے۔جس کا شکر ادا کیا جائے۔قدر کیا ہوا۔﴿ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴾(17/بنی اسرائیل:19) ''پس یہی لوگ ہیں جن کی کوشش کی (اللہ کے ہاں) قدردانی کی جائے گی۔''

شَكُوْرٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بے انتہا شکر کرنے والا۔ بڑا قدر دان۔﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴾ (14/ابراہیم:5) ''بے شک اس میں نشانیاں ہیں بار بار صبر کرنے والے، بے انتہا شکر کرنے والے کے لئے۔''﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴾(42/الشوریٰ:23) ''بے شک اللہ بے انتہا بخشنے والا بے انتہا قدر کرنے والا ہے۔''

ترکیب ثُمَّ۔حرف عطف ہے۔عَفَوْنَا، ماضی کا جمع متکلم کا صیغہ ہے۔عَنْكُمْ متعلق فعل ہے۔مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ کا اشارہ گوسالہ پرستی کی طرف ہے۔ لَعَلَّ حرف مشبہ بالفعل ہے۔اس کا اسم،ضمیر متصل كُمْ ہے اور جملہ فعلیہ تَشْكُرُوْنَ اس کی خبر ہے۔

ترجمہ	ثُمَّ عَفَوْنَا	عَنْكُمْ	مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ	لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٢﴾
البقرۃ:52	پھر ہم نے درگزر کیا	تم لوگوں سے	اس کے بعد	تا کہ تم لوگ شکر کرو

آیت:53

﴿ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿٥٣﴾ ﴾

اِذْ:البقرۃ آیت30دیکھیں۔ ء ت ی:البقرۃ آیت23دیکھیں۔ ك ت ب:البقرۃ آیت2دیکھیں۔
ف ر ق:البقرۃ آیت50دیکھیں۔ لَعَلَّ:البقرۃ آیت21دیکھیں۔ ھ د ی: الفاتحہ آیت5دیکھیں۔

ترکیب 'وٗ'عطف کا ہے۔اِذْ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے اُذْكُرُوْا محذوف ہے۔اٰتَيْنَا ماضی کا جمع متکلم کا صیغہ ہے۔مُوْسَى اس کا مفعول اوّل ہے اور اَلْكِتٰبَ مفعول ثانی ہے۔اَلْفُرْقَانَ عطف ہے اَلْكِتٰبَ پر۔لَعَلَّ حرف مشبہ بالفعل ہے۔ضمیر متصل،كُمْ اس کا اسم ہے اور جملہ فعلیہ تَهْتَدُوْنَ اس کی خبر ہے۔

ترجمہ	وَاِذْ اٰتَيْنَا	مُوْسَى	الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ	لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿٥٣﴾
البقرۃ:53	اور (یاد کرو) جب ہم نے دی	موسیٰؑ کو	کتاب اور فرقان	تا کہ تم ہدایت پاؤ

نوٹ یہاں کتاب سے مراد تورات ہے اور فرقان کے بارے میں ہمارے بزرگوں کے متعدد اقوال ہیں۔ چنانچہ بعض بزرگوں کے نزدیک کتاب اور فرقان کے درمیان 'وٗ' تفسیری ہے اور فرقان سے مراد تورات ہی ہے۔بعض کے نزدیک اس سے ''معجزات'' مراد ہیں۔بعض کے نزدیک ''فتح وغلبہ'' مراد ہے۔بعض کے نزدیک ''احکام شرعیہ'' یا ''دین کا علم وفہم'' مراد ہے۔(واللّٰہ اعلم)۔

آیت:54

﴿وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖ یٰقَوۡمِ اِنَّكُمۡ ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ بِاتِّخَاذِكُمُ الۡعِجۡلَ فَتُوۡبُوۡۤا اِلٰی بَارِئِكُمۡ فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ ذٰلِكُمۡ خَیۡرٌ لَّكُمۡ عِنۡدَ بَارِئِكُمۡ ؕ فَتَابَ عَلَیۡكُمۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۵۴﴾﴾

اِذۡ: البقرۃ آیت30 دیکھیں۔	ق و ل: البقرۃ آیت8 دیکھیں۔	ظ ل م: البقرۃ آیت17 دیکھیں۔
ن ف س: البقرۃ آیت9 دیکھیں۔	ء خ ذ: البقرۃ آیت48 دیکھیں۔	ع ج ل: البقرۃ آیت51 دیکھیں۔
ت و ب: البقرۃ آیت37 دیکھیں۔		

ب ر ء

(ف) **بَرَءًا** اس کا بنیادی مفہوم ہے جدا کرنا، چاک کرنا، پھاڑ کر الگ کرنا۔ پھر اس سے مراد لیا جاتا ہے کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا۔ وجود بخشنا۔ پیدا کرنا۔ ﴿مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِیۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ﴾ (57/الحدید:22) ''نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر اس سے پہلے کہ ہم اُس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

بَارِئٌ اسم الفاعل ہے۔ عدم سے وجود میں لانے والا۔ خالق۔ اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ ﴿هُوَ اللّٰهُ الۡخَالِقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ﴾ (59/الحشر:24) ''وہ اللہ ہی پیدا کرنے والا، وجود بخشنے والا، صورت بنانے والا ہے۔''

بَرِیَّةٌ اسم ذات ہے۔ وجود دی ہوئی چیز۔ مخلوق۔ فَعِیۡلَةٌ کے وزن پر بَرِیۡئَةٌ بھی پڑھتے ہیں اور 'ء' کو 'ی' میں تبدیل کر کے بَرِیَّةٌ بھی پڑھتے ہیں۔ فَعِیۡلَةٌ کے وزن پر بمعنی اسم المفعول ہے۔ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّةِ ؕ﴾ (98/البینۃ:7) ''یہ لوگ ہی سب سے بہتر مخلوق ہیں۔''

(س) **بَرَءًا اور بَرَآءَةً** کسی مکروہ یا تکلیف دہ چیز سے نجات حاصل کرنا۔ بیزار ہونا۔

بَرِیۡءٌ ج: بُرَءٰٓؤُا اور بَرِیۡـُٔوۡنَ۔ بَرَآءَةٌ سے فَعِیۡلٌ کے وزن پر اسم الفاعل ہے۔ بیزار۔ لاتعلق۔ بری ءالذمہ۔ ﴿وَّاِنَّنِیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۹﴾﴾ (6/الانعام:19) ''اور یقیناً میں بیزار ہوں اس سے جو تم لوگ شرک کرتے ہو۔'' ﴿اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾ (60/الممتحنۃ:4) ''یقیناً ہم بیزار ہیں تم لوگوں سے اور اس سے جس کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا۔'' ﴿اَنۡتُمۡ بَرِیۡٓـُٔوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَاَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۱﴾﴾ (10/یونس:41) ''تم بری الذمہ ہو اس سے جو میں کرتا ہوں اور میں بری الذمہ ہوں اس سے جو تم کرتے ہو۔'' جب بَرِیۡءٌ بطور صفت استعمال ہو تو وہ واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مؤنث ہونے میں اپنے موصوف کے مطابق ہوتا ہے۔

بَرَآءٌ بیزار۔ لاتعلق۔ اصل میں مصدر ہے اور بطور صفت بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب بطور صفت استعمال ہو تو واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مؤنث سب کے لیے اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔ ﴿اِنَّنِیۡ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ (43/الزخرف:26) ''یقیناً میں بیزار ہوں اس سے جس کی تم لوگ عبادت کرتے ہو۔''

بَرَاءَةٌ اسم ذات بھی ہے۔(۱) بیزاری۔ قطع تعلقی۔ ﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾ (9/التوبہ:1) ''(یہ اعلانِ) بیزاری ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان لوگوں سے جن سے تم لوگوں نے معاہدہ کیا مشرکوں میں سے۔'' (۲) معافی۔ چھٹکارا۔ ﴿اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ۝﴾ (54/القمر:43) ''یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لیے کوئی مُعافی لکھی ہوئی ہے؟'' (ترجمہ تفہیم القرآن)۔ ''یا تمہارے لیے اگلی کتابوں میں چھٹکارا لکھا ہوا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

(افعال) اِبْرَاءً بیماری سے نجات دینا۔ شفا دینا۔ ﴿وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ﴾ (3/آل عمران:49) ''اور میں شفا دیتا ہوں اندھے اور کوڑھی کو۔''

(تفعیل) تَبْرِئَةً ، تَبْرِيَةً اس کا مصدر تَفْعِلَةٌ کے وزن پر تَبْرِئَةٌ بھی پڑھا جاتا ہے اور تَبْرِيَةٌ بھی۔ الزام سے نجات دینا۔ بری ءالذمہ قرار دینا۔ ﴿فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا﴾ (33/الاحزاب:69) ''تو بری قرار دیا انؑ کو اللہ نے اس سے جو ان لوگوں نے کہا۔''

مُبَرَّءٌ ج: مُبَرَّءُوْنَ۔ اسم المفعول ہے۔ بری کیا ہوا۔ ﴿اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ﴾ (24/النور:26) ''یہ لوگ بری کیے ہوئے ہیں اس سے جو وہ لوگ کہتے ہیں۔''

(تفعّل) تَبَرُّءًا مکروہ چیز سے خود بیزار ہو جانا۔ اعلان براءت کرنا۔ بیزاری کا اظہار کرنا۔ ﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ﴾ (9/التوبہ:114) ''پھر جب واضح ہوا انؑ پر کہ یقیناً وہ یعنی آذر دشمن ہے اللہ کا تو انہوں نے اعلان براءت کیا اس سے۔''

ق	ت	ل

(ن) قَتْلًا کسی کو قتل کرنا۔ یہ یک طرفہ عمل ہے۔ ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝﴾ (4/النساء:157) ''اور ان لوگوں نے یعنی یہودیوں نے یقیناً قتل نہیں کیا انؑ کو یعنی عیسیٰؑ کو۔''

اُقْتُلْ ج: اُقْتُلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو قتل کر۔ ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (9/التوبہ:5) ''پس جب نکل جائیں حرمت والے مہینے تو تم لوگ قتل کرو مشرکوں کو۔'' اور آیت زیر مطالعہ۔

قَتْلٌ اسم ذات بھی ہے۔ قتل۔ ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (2/البقرہ:191) ''اور فتنہ زیادہ شدید ہے قتل سے۔''

قُتِلَ ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ وہ قتل کیا گیا۔ ﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا﴾ (17/بنی اسرائیل:33) ''اور جو قتل کیا گیا ناحق۔'' یہ بددعائیہ جملہ بھی ہے۔ لیکن کلام الٰہی میں اس سے مراد ہوتا ہے کہ اللہ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ ﴿فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝﴾ (74/المدثر:19) ''ہلاک ہو کیسی بات تجویز کی۔'' ﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝﴾ (85/البروج:4) ''ہلاک ہوں کھائی کھودنے والے۔''

قَتِيْلٌ ج: قَتْلٰى۔ فَعِيْلٌ کے وزن پر اسم المفعول کے معنی میں مقتول مراد ہے۔ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى﴾ (2/البقرۃ:178) ''اے ایمان والو فرض کر دیا گیا ہے تم پر مقتولوں کا قصاص (لینا)۔''

تَقْتِيْلًا کثرت اور شدت سے قتل کرنا۔ ﴿سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ﴾ (7/الاعراف:127) ''ہم قتل کرتے رہیں گے ان کے بیٹوں کو۔''

(مفاعلہ) مُقَاتَلَةً اور قِتَالًا ایک دوسرے کو قتل کرنا۔ جنگ کرنا۔ لڑائی کرنا۔ اس فعل کی نسبت اگر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو بددعا کا مفہوم ہوتا ہے یعنی

ہلاک کرے۔ ﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ﴾ (57/الحدید:10) ''برابر نہیں ہے تم لوگوں میں سے وہ جس نے خرچ کیا فتح سے پہلے اور قتال کیا۔ وہ لوگ زیادہ عظیم ہیں بلحاظ درجے کے، ان لوگوں سے جنہوں نے خرچ کیا بعد میں اور قتال کیا۔'' ﴿قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝﴾ (9/التوبہ:30) ''ہلاک کرے ان کو اللہ، کدھر بہکے جا رہے ہیں۔''

قَاتِلْ ج: قَاتِلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو جنگ کر۔ تو قتال کر۔ ﴿فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ﴾ (4/النساء:84) ''پس آپ قتال کیجئے اللہ کی راہ میں۔'' ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (2/البقرہ:190) ''اور تم لوگ قتال کرو اللہ کی راہ میں۔''

(افتعال) اِقْتِتَالًا اہتمام سے لڑنا۔ آپس میں لڑنا۔ ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫﴾ (2/البقرہ:253) ''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ آپس میں نہ لڑتے۔''

خ ی ر

(ض) خَيْرًا فائدہ مند ہونا۔ صاحبِ خیر ہونا۔

خِيَرًا، خِيَرَةً پسند کرنا۔ انتخاب کرنا۔ فضیلت دینا۔

خَيْرٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ وہ چیز جو سب کو پسندیدہ ہو۔ (۱) عربی زبان میں یہ لفظ ہر بھلائی، نیکی، خیر اور نیک کام پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ (2/البقرہ:110) ''اور جو نیکی بھی تم آگے بھیجو گے اپنے لیے تو تم پاؤ گے اس کو (یعنی اس کا اجر) اللہ کے ہاں۔'' ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ (3/آل عمران:104) ''اور ضرور ہونی چاہیے تم میں ایک ایسی جماعت جو نیکی کی طرف بلائے۔'' (۲) مال و دولت۔ عرب مال کو بھی خیر سے تعبیر کرتے تھے گویا مال بھلائی ہی بھلائی ہے۔ ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝﴾ (100/العٰدیٰت:8) ''اور یقیناً وہ مال کی محبت میں شدید ہے۔'' ﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ﴾ (2/البقرہ:215) ''آپ فرمائیے جو کچھ خرچ کرو اپنے مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں۔''

خَيْرٌ اس مادہ کا افعل التفضیل اَخْيَرُ بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بجائے زیادہ تر خَيْرٌ استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں بھی خَيْرٌ استعمال ہوا ہے۔ اَخْيَرُ کہیں نہیں آیا۔ بہتر یا سب سے بہتر۔ ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ﴾ (7/الاعراف:12) ''میں بہتر ہوں اس سے۔'' ﴿بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ۝﴾ (3/آل عمران:150) ''بلکہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔'' خَيْرٌ کا استعمال جب افعل التفضیل کے معنی میں ہو تو اس کی جمع نہیں آتی۔ (لغات القرآن، ج ۲، ص ۳۲۹)

خَيْرَاتٌ یہ خَيْرَةٌ کی جمع سالم ہے۔ بھلائیاں۔ نیکیاں۔ نیک عورتیں۔ بہترین اخلاق والی عورتیں۔ ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ﴾ (21/الانبیاء:90) ''بیشک وہ لوگ جلدی کیا کرتے تھے نیکیوں میں۔'' ﴿فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ۚ۝﴾ (55/الرحمٰن:70) ''اُن میں نیک سیرت، خوبصورت عورتیں ہیں۔''

اَخْيَارٌ خَيْرٌ کی اَفْعَالٌ کے وزن پر جمع مکسر ہے۔ بہت خیر والے۔ ﴿وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ؕ۝﴾ (38/صٓ:48) ''اور یاد کرو اسمٰعیلؑ کو اور یَسَعؑ کو اور ذوالکفل کو، وہ سب بہت خیر والوں میں سے تھے۔''

خِيَرَةٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔اختیار۔﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ﴾(33/الاحزاب:36)''نہیں ہے کسی مومن مرد کے لیے اور نہ ہی کسی مومن عورت کے لیے، جب فیصلہ کرے اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا، کہ ہو ان کے لیے پسند کرنے کا اختیار اپنے کام میں۔''

(تفعّل) تَخَيُّرًا کسی چیز کو اپنے لیے پسند کرنا۔﴿ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴾(56/الواقعہ:20)''اور پھل، اس میں سے جو وہ لوگ پسند کریں۔''

(افتعال) اِخْتِيَارًا چن لینا۔منتخب کرنا۔﴿ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا ﴾(7/الاعراف:155)''اور چن لیے حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے ستر مرد۔''

عِنْدَ یہ ظرف ہے اور قرب کے معنی دیتا ہے۔پھر کبھی تو بطور ظرف مکان، قربِ مکانی کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ ﴾(27/النمل:40)''پھر جب حضرت سلیمانؑ نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا'' یا فرمایا: ﴿ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴾(53/النجم:15)''اس کے قریب جنۃ الماویٰ ہے۔''اور کبھی بطور ظرف زمان، قرب زمانی کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً عِنْدَ الصُّبْحِ۔صبح کے قریب یا عِنْدَ طلوعِ الشمسِ سورج نکلنے کے قریب۔اور کبھی معنوی طور پر قرب ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ ﴾(27/النمل:40)''اس شخص نے کہا جس کے پاس کتاب میں سے علم تھا'' یا فرمایا: ﴿ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴾(3/آل عمران:169)''بلکہ وہ لوگ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے۔''اس پر حرف جر میں سے صرف مِنْ آتا ہے جو مزید تاکید کا مفہوم پیدا کرتا ہے اور کوئی حرف نہیں آتا۔جیسے فرمایا: ﴿ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ ﴾(4/النساء:81)''پھر جب باہر نکلتے ہیں آپؐ کے پاس سے۔''(واللّٰہ اعلم)۔

ت و ب: البقرۃ آیت 37 دیکھیں۔ ر ح م: آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ترکیب 'وٗ' عطف کا ہے۔اِذْ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے اُذْكُرُوْا محذوف ہے۔قَالَ کا فاعل مُوْسٰى ہے اور لِقَوْمِهٖ متعلق فعل ہے۔يَا قَوْمِ میں میم کی کسرہ بتا رہی ہے کہ اس کا مضاف الیہ یائے متکلم محذوف ہے۔یعنی یہ فقرہ دراصل يَاقَوْمِيْ ہے۔اِنَّ کا اسم كُمْ ہے اور ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ جملہ فعلیہ اِنَّ کی خبر ہے۔بِاتِّخَاذِ میں 'ب' سببیہ ہے اور اِتِّخَاذِ مصدر ہے اور مضاف ہونے کی وجہ سے لام تعریف اور تنوین سے خالی ہے۔كُمْ اس کا مضاف الیہ ہے۔یہاں پر مصدر، فعل کا کام کر رہا ہے اس لیے اِتِّخَاذِ کا مفعول اوّل اَلْعِجْلَ ہے اور اس کا مفعول ثانی اِلٰهًا محذوف ہے۔فَتُوْبُوْٓا میں 'ف' استئنافیہ ہے اور تُوْبُوْا فعل امر ہے۔اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر اَنْتُمْ ہے۔اِلٰى بَارِئِكُمْ متعلق فعل ہے۔تَابَ کے ساتھ جب اِلٰی کا صلہ آئے تو مطلب ہوتا ہے بندے کا اپنی غلطی پر پشیمان ہو کر اللہ کی طرف رجوع کرنا یعنی توبہ کرنا۔آگے فَاقْتُلُوْٓا میں 'ف' عطف کا ہے۔اور اُقْتُلُوْا، تُوْبُوْا پر عطف ہے۔اَنْفُسَكُمْ اس کا مفعول ہے۔ذٰلِكُمْ مبتدا ہے، خَيْرٌ، خبر اور لَكُمْ متعلق خبر ہے۔عِنْدَ بَارِئِكُمْ ظرف ہے آگے فَتَابَ عَلَيْكُمْ سے پہلے ''فَفَعَلْتُمْ مَا اَمَرَكُمْ بِهٖ مُوْسٰى'' محذوف ہے۔تَابَ کا فاعل اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔عَلَيْكُمْ متعلق فعل ہے۔تَابَ کے ساتھ جب عَلٰی کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے اللہ کا اپنی رحمت کے ساتھ بندے کی طرف رجوع کرنا یعنی توبہ قبول کرنا۔اِنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے۔اس سے متصل ضمیر اس کا اسم ہے۔هُوَ ضمیر فاصل ہے اور تاکید کے لیے ہے اور اَلتَّوَّابُ اور اَلرَّحِيْمُ اس کی خبریں ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى	لِقَوْمِهٖ	يٰقَوْمِ	اِنَّكُمْ	ظَلَمْتُمْ
اور (یاد کرو) جب کہا موسیٰؑ نے	اپنی قوم سے	اے میری قوم	بے شک تم نے	ظلم کیا

ترجمہ
البقرۃ:54

اَنۡفُسَكُمۡ	بِاتِّخَاذِكُمُ	الۡعِجۡلَ	فَتُوۡبُوۡۤا	اِلٰى بَارِئِكُمۡ
اپنے آپ پر	بسبیتمہارے بنانے کے	بچھڑے کو(معبود)	پس تم توبہ کرو	اپنے خالق سے

فَاقۡتُلُوۡۤا	اَنۡفُسَكُمۡ ؕ	ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ	لَّكُمۡ	عِنۡدَ بَارِئِكُمۡ ؕ
اور تم قتل کرو	اپنوں کو(یعنی جنہوں نے شرک کیا)	یہ بہتر ہے	تمہارے لیے	تمہارے خالق کے نزدیک

فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ ؕ	اِنَّهٗ	هُوَ التَّوَّابُ	الرَّحِيۡمُ ﴿۵۴﴾
پس اس (اللہ) نے تمہاری توبہ قبول کی	یقیناًوہ	بہت ہی توبہ قبول کرنے والا	انتہائی رحم کرنے والا ہے

نوٹ :1 آیت میں قوم سے مراد خاص وہ لوگ ہیں جنہوں نے بچھڑے کو سجدہ کیا اور فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ سے یہ مراد نہیں کہ ہر شخص نے خود اپنی گردن پر تلوار چلا دے۔ دراصل حکم یہ تھا کہ ہر قبیلہ کے ایسے افراد جنہوں نے بچھڑے کی پرستش میں حصہ نہیں لیا تھا، اپنے قبیلہ کے ان لوگوں کو قتل کریں جنہوں نے اس کی پرستش کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باپ نے بیٹے کو، بیٹے نے باپ کو اور بھائی نے بھائی کو قتل کیا۔ اس صورتحال کو اپنے آپ کو قتل کرنا کہا گیا ہے۔

نوٹ :2 بنواسرائیل نے جب توبہ کر لی یعنی اپنے مجرموں کو قتل کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ یہاں پر کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ اُلجھن پیدا ہوتی ہے کہ مجرموں کو تو ان کے جرم کی سزا دی گئی پھر توبہ کہاں قبول ہوئی۔

اس ضمن میں پہلی بات یہ سمجھ لیں کہ توبہ کی قبولیت کا تعلق آخرت کی سزا سے ہے۔ اگر توبہ کرنے کے باوجود کسی کو اپنے گناہ کی سزا دنیا میں ملتی ہے تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہے۔ اور ایسی صورت میں توبہ کی قبولیت یعنی آخرت کی سزا سے بچنے کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے۔ اگر کسی کی توبہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آخرت کی سزا کے ساتھ اس کی دنیا کی سزا بھی معاف کر دے تو یہ اضافی رحمت یعنی اس کا فضل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کچھ جرائم کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ توبہ کرنے سے دنیا کی سزا ساقط نہیں ہوتی۔ مثلاً قتل عمد کا مجرم اگر توبہ کر لے تب بھی پھانسی کی سزا برقرار رہے گی اِلّا یہ کہ مقتول کے ورثاء معاف کر دیں یا ثبوت زنا بالشہادۃ پر رجم۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ لوگوں نے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور درخواست کی کہ انہیں رجم کی سزا دی جائے تا کہ ان کی توبہ کی قبولیت اور آخرت کی سزا سے بچنے کی صورت پیدا ہو۔

آیت :55

﴿وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰى لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾﴾

اِذۡ: البقرۃ آیت30 دیکھیں۔ ق و ل: البقرۃ آیت8 دیکھیں۔ ء م ن: البقرۃ آیت3 دیکھیں۔

حَتّٰى یہ لفظ کسی چیز کی انتہا اور غایت بتلانے کے لیے آتا ہے۔ یہ صرف اسم یا فعل پر داخل ہوتا ہے، کسی ضمیر پر داخل نہیں ہوتا۔ یہ تین طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ (۱) بطور حرف جر۔ (تک۔Till)۔ اسم کو جر دیتا ہے (عامل)۔ عربی میں کہتے ہیں اَكَلۡتُ السَّمَكَةَ حَتّٰى رَاۡسِهَا (میں نے مچھلی کو اس کے سر تک کھایا یعنی سر نہیں کھایا)۔ قرآنِ مجید میں فرمایا ﴿حَتّٰى حِيۡنٍ﴾ (12/یوسف:35) ''کچھ سالوں تک۔'' ﴿حَتّٰى مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ﴿۵﴾﴾ (97/القدر:5) ''فجر کے طلوع ہونے تک۔''

(۲) بطور ناصب مضارع۔ (یہاں تک کہ۔ تا کہ)۔ مضارع پر داخل ہوتو مضارع کو نصب دیتا ہے (عامل)۔ عربی میں کہتے ہیں لَنْ اَجْلِسَ حَتّٰی یَأْذَنَ الْمُعَلِّمُ۔ میں نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ استاد اجازت دے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (3/آل عمران:92) ''تم ہرگز بھلائی نہ پاؤ گے جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز میں سے خرچ نہیں کرو گے۔'' یا فرمایا: ﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ﴾ (2/البقرۃ:214) ''چھوا ان کو سختی اور مصیبت نے اور وہ ہلا دیے گئے یہاں تک کہ (وقت کے) رسول اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے کہہ اٹھے کب آئے گی اللہ کی مدد۔''

(۳) بطور حرفِ عطف (یہاں تک کہ)۔ غیر عامل ہے۔ اَکَلْتُ السَّمَکَةَ حَتّٰی رَاْسَهَا (میں نے مچھلی کھائی یہاں تک کہ اس کا سر بھی کھا گیا)۔ یہاں ماقبل کا نصب مابعد کو بھی آ گیا ہے۔ لغات القرآن کے مطابق قرآنِ مجید میں حَتّٰی بطورِ عطف استعمال نہیں ہوا۔ (واللّٰہ اعلم)۔

ر ء ی

(ف) رُؤْیَةً اور رَاْیًا

اس کا ماضی رَاٰی اور مضارع میں ہمزہ کو حذف کر کے یَرٰی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کا ادراک کرنا۔ دیکھنا۔ خواہ آنکھوں سے دیکھنا ہو، عقل و بصیرت سے دیکھنا ہو یا خواب میں دیکھنا ہو۔ دیکھنے کے لیے یہ لفظ عام ہے۔ پھر یہ لفظ خیال کرنا یا غور و فکر کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے لیے فرمایا: ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا﴾ (6/الانعام:76) ''پھر جب چھا گئی انؑ پر رات تو انہوں نے دیکھا ایک تارا۔'' ﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰی كَافِرَةٌ یَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ﴾ (3/آل عمران:13) ''ایک گروہ لڑتا تھا اللہ کی راہ میں اور دوسرا کافر تھا۔ دیکھ رہے تھے (مسلمان) انہیں اپنے سے دو چند (اپنی) آنکھوں سے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ عقل و بصیرت سے دیکھنے کے لیے فرمایا: ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی﴾ (53/النجم:11) ''جھوٹ نہیں کہا رسولؐ کے دل نے جو دیکھا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ یہاں رؤیت بمعنی عقل و بصیرت سے دیکھنا ہے۔ خواب میں دیکھنے کے لیے فرمایا: ﴿اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی﴾ (37/الصافات:102) ''بے شک میں دیکھتا ہوں نیند میں کہ میں ذبح کرتا ہوں تجھ کو پس تو دیکھ کہ تو کیا خیال کرتا ہے۔'' خیال کرنے یا تصور کرنے کے لیے فرمایا: ﴿وَلَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ (2/البقرہ:165) ''اور کاش تصور کریں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا (اس وقت کا) جب وہ لوگ دیکھیں گے عذاب کو۔'' جب اس کے ساتھ ہمزہ استفہام ہو، جیسے اَرَاَیْتَ (کیا تو نے دیکھا) یا اَرَاَیْتُمْ (کیا تم نے دیکھا) تو اس سے مراد لی جاتی ہے 'کسی کی حالت پر غور کرنا'، 'یا کسی چیز کو جاننا' یا پھر یہ اَخْبِرْنِیْ (تو مجھے بتا) یا اَخْبِرُوْنِیْ (تم مجھے بتاؤ) کے قائم مقام ہوتا ہے۔ مثلاً: ﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (25/الفرقان:43) ''کیا آپؐ نے اس کی بھی حالت دیکھی ہے جس نے اپنی خواہشوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُكَذِّبُ بِالدِّیْنِ﴾ (107/الماعون:1) ''کیا آپؐ نے دیکھا اُس کو جو (روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے۔'' یعنی کیا آپؐ نے جانا اور پہچانا اُس شخص کو جو روزِ جزا کو نہیں مانتا۔ ﴿اَفَرَءَیْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِیْنَ﴾ (26/الشعراء:205) ''ذرا بتلا اگر ہم انہیں چند سال تک عیش میں رہنے دیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ﴿قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ﴾ (26/الشعراء:75) ''حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کیا تم نے دیکھا یا کیا تم نے ان کی حالت پر غور کیا جنہیں تم پوجتے ہو۔'' ﴿اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ﴾ (56/الواقعۃ:58) ''اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم جو منی پہنچاتے ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ کبھی اس کے آگے کاف خطاب بھی لگا دیا جاتا ہے یعنی اَرَاَیْتَكَ یا اَرَاَیْتَكُمْ۔ ایسی

صورت میں 'ت' تبدیل نہیں ہوتی بلکہ کاف خطاب حسبِ مقام تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ﴿ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ﴾ (17/ بنی اسرائیل:62) ''اس نے کہا مجھے بتا یہ (آدم) جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ﴿ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ ﴾ (6/ الانعام:40) ''آپؐ کہیے کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آ پڑے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ جب اس کے ساتھ اِلٰی کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کسی چیز کی حالت پر غور کر کے اسے سمجھنا اور اس سے عبرت حاصل کرنا۔ ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ ﴾ (25/ الفرقان:45) ''کیا آپؐ نے اپنے رب (کی قدرت) کی طرف نظر نہیں کی۔'' (نوٹ: مادہ رءی کی املاء اور استعمال کے متعلق کچھ ضروری باتیں آگے نوٹ میں دیکھیں)

رأْيٌ اسم ذات بھی ہے۔ رائے۔ خیال۔ ﴿ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ﴾ (11/ ھود:27) ''اور ہم تو بس یہی دیکھتے ہیں کہ تمہارے پیرو وہی ہوئے ہیں جو ہم میں سے بالکل رذیل ہیں (اور وہ بھی) سرسری رائے سے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ بَادِيُ الرَّأْيِ۔ ابتدائی رائے یا ظاہری، سرسری رائے۔

رُؤْيَا اسم ذات ہے۔ یہ فُعْلٰی کا وزن ہے۔ اس لیے مبنی کی طرح استعمال ہوتا ہے۔ کبھی 'ء' کو حذف کر کے واؤ کے ساتھ رُوْيَا بھی کہہ دیتے ہیں۔ اس کا عام اور مشہور معنی ''خواب'' ہے۔ مثلاً فرمایا: ﴿ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ ﴾ (12/ یوسف:5) ''تو مت بیان کر اپنے خواب کو اپنے بھائیوں سے۔'' اور حدیث مبارک میں فرمایا: لَمْ يَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّةِ اِلَّا الرُّؤْيَا۔ یعنی مبشراتِ نبوت میں سے صرف خواب رہ گئے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ عربی زبان میں رُؤْيَا مصدر بمعنی ''حالت بیداری میں دیکھنا'' اور اسم ذات بمعنی ''نظارہ، منظر'' بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اِن معنوں میں قرآن مجید میں فرمایا: ﴿ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ﴾ (17/ بنی اسرائیل:60) ''اور وہ دکھلاوا جو تجھ کو دکھلایا ہم نے سو جانچنے کو لوگوں کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ''ہم نے واقعہ معراج میں جو تماشا (بحالتِ بیداری) آپؐ کو دکھلایا تھا......'' (ترجمہ حضرت تھانویؒ)۔ ''اور ہم نے جو منظر آپؐ کو دکھلایا تھا اسے ہم نے لوگوں کی آزمائش کا سبب بنا دیا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ''صاحبؒ ضیاء القرآن اِس آیت میں الرُّءْيَا کا ترجمہ ''نظارہ'' کرتے ہیں اور حاشیے میں فرماتے ہیں: ''اس آیت میں رؤیا کا لفظ خواب کے معنی میں مستعمل نہیں بلکہ عالمِ بیداری میں دیکھنے کے لیے مستعمل ہے حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے المراد برؤیا ھھنا رؤیا عین یہاں رؤیا سے مراد عالمِ بیداری میں دیکھنا ہے۔ سعید بن جبیر، حسن، مسروق، قتادہ، مجاہد، عکرمہ، ابن جریر اور ان کے علاوہ کثیر التعداد علماء تفسیر کی یہی رائے ہے اور اہل عرب کہتے ہیں رأیت بعینی رویۃً و رؤیا (مظہریؒ)۔'' (ضیاء القرآن، ج۲، ص۶۶۸)

رِءْيٌ اسم ذات ہے۔ ''وہ دلکش حالت اور ظاہری لباس جو آنکھوں سے دکھائی دے۔'' (ضیاء القرآن، ج۳، ص ۹۴)۔ نمود و نمائش۔ ظاہری سج دھج۔ یہ رُؤْيَةٌ سے مشتق ہے۔ ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ۝ ﴾ (19/ مریم:74) ''اور کتنی قومیں اُن سے پہلے تھیں جن کو ہم نے برباد کر دیا، وہ ساز و سامان اور ظاہری سج دھج میں ان سے بہتر تھیں۔''

(افعال) **اِرَاءَةً** اور **اِرَاءً** اس کا ماضی۔ مضارع اَرٰی - یُرِیْ استعمال ہوتا ہے۔ دکھانا۔ سمجھانا۔ اس کے عموماً دو مفعول ہوتے ہیں یعنی کس کو دکھایا اور کیا دکھایا اور دونوں بغیر صلے کے آتے ہیں۔ ﴿ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (6/ الانعام:75) ''اور اس طرح ہم نے دکھائی ابراہیمؑ کو زمین اور آسمانوں کی بادشاہت۔'' ﴿ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا

مَآ اَرٰی ﴾(40/مؤمن:29)''بولا فرعون میں تو وہی بات سمجھا تا ہوں تم کو جو سوجھی مجھ کو۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)

اَرِ ج:اَرُوْا۔ فعل امر ہے۔تو دکھا۔تو سمجھا۔﴿ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا ﴾(2/البقرہ:128)''اور تو دکھا اور سمجھا ہم کو ہماری عبادت کے طریقے۔''﴿ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ ﴾(31/لقمان:11)''یہ سب کچھ بنایا ہوا ہے اللہ کا اب دکھلاؤ مجھ کو کیا بنایا ہے اوروں نے جو اُس کے سوا ہیں۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)

(مفاعلہ) رِئَاءً اور رِیَاءً اس کا ماضی۔مضارع رَاٰی۔ یُرْءِیْ استعمال ہوتا ہے۔حقیقت کے خلاف دکھانا۔دکھاوا کرنا۔ ریا کاری کرنا۔ ﴿ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾(4/النساء:142)''وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں اور یاد نہیں کرتے اللہ کو مگر تھوڑا سا۔''﴿ وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ ﴾(4/النساء:38)''اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے۔''

(تفاعل) تَرَاءٍ اس کا ماضی۔مضارع تَرَاٰی۔ یَتَرَاٰی استعمال ہوتا ہے۔ایک دوسرے کو دیکھنا۔آمنے سامنے ہونا۔﴿ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ ﴾(8/الانفال:48)''پھر جب آمنے سامنے ہوئیں دو جماعتیں تو وہ پیچھے ہٹا اپنی ایڑیوں کے بل۔''

اَللّٰهُ(ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ج ھ ر

(ف) جَهْرًا، جَهْرَةً اور جِهَارًا اس کا بنیادی مفہوم ہے نمایاں کرنا۔ظاہر کرنا۔پھر عام طور پر یہ لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔(۱) آواز کو ظاہر کرنا (یعنی بلند کرنا) اور اعلان کرنا تا کہ دوسرے سن لیں۔(۲) کسی چیز کو دکھانے کے لیے ظاہر کرنا تا کہ وہ کھلم کھلا دکھائی دے۔ چنانچہ آواز کے لیے فرمایا:﴿ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ ﴾(13/الرعد:10)''برابر ہیں تم میں سے وہ جو چھپائے بات کو اور وہ جو نمایاں کرے اس کو۔''﴿ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۙ ﴾(71/نوح:8)''پھر میں نے دعوت دی ان کو آواز بلند کرتے ہوئے۔''﴿ لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ ﴾(4/النساء:148)''برائی کے ساتھ آواز بلند کرنے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا مگر مظلوم کو اجازت ہے۔''(ترجمہ احسن البیان)۔اور دیکھنے کے لیے فرمایا:﴿ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً ﴾(4/النساء:153)''تو انہوں نے کہا تو دکھا ہمیں اللہ کھلم کھلا۔''اور آیت زیر مطالعہ۔اور عام مفہوم کے اعتبار سے فرمایا:﴿ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾(6/الانعام:3)''وہ جانتا ہے تمہارے چھپانے کو اور تمہارے نمایاں کرنے کو اور وہ جانتا ہے جو تم لوگ کماتے ہو۔''

اِجْهَرْ ج:اِجْهَرُوْا۔فعل امر ہے۔تو نمایاں کر۔﴿ وَ اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ ﴾(67/الملک:13)''اور تم لوگ چھپاؤ اپنی بات کو یا نمایاں کرو اس کو۔''

ء خ ذ: البقرۃ آیت48دیکھیں۔ ص ع ق: البقرۃ آیت19دیکھیں۔ ن ظ ر: البقرۃ آیت50دیکھیں۔

ترکیب 'وٗ حرف عطف ہے۔ اِذْ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے اُذْكُرُوْا محذوف ہے۔ قُلْتُمْ ، ماضی میں جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔یَا حرف ندا ہے۔اور مُوْسٰی، منادیٰ ہے۔ لَنْ ، نواصب مضارع میں سے ہے اس لیے نُؤْمِنَ حالت نصب میں ہے اور لَكَ متعلق فعل ہے۔ یاد کر لیجئے اگر اٰمَنَ یُؤْمِنُ کے ساتھ 'لِ' کا صلہ آئے تو اس سے مراد ہوتی ہے کسی کی بات کو تسلیم کر لینا خواہ اس میں دلی یقین شامل نہ ہو۔اور اگر 'بِ' کا صلہ آئے تو مراد ہوتی ہے قلبی

یقین کے ساتھ کسی کی بات کو ماننا۔ گویا یہاں پر بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ سے کہہ رہے ہیں کہ تورات کی قلبی تصدیق تو دور کی بات، ہم ظاہری طور پر بھی آپؑ کی بات اس وقت تک نہ مانیں گے جب تک ہم علانیہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ لیتے۔ حَتّٰی بھی نواصب مضارع میں سے ہے اس لیے نَرٰی حالت نصب میں ہے۔ نَرٰی فعل اس میں شامل ضمیر اِس کا فاعل، لفظ اَللّٰہَ اس کا مفعول اور جَھْرَۃً حال ہے۔ جَھْرَۃً کو قُلْتُمْ کی ضمیر فاعلی کا حال بھی مانا گیا ہے اور لفظ اَللّٰہَ کا بھی۔ اگر قُلْتُمْ کی ضمیر فاعلی کا حال مانیں تب مطلب ہوگا جب تم نے بآواز بلند کہہ دیا اور اگر لفظ اَللّٰہَ کا حال مانیں تب مطلب ہوگا جب تک اللہ کو علانیہ یا کھلم کھلا نہیں دیکھ لیتے۔ ہمارے اکثر بزرگوں نے اسے لفظ اَللّٰہَ کا حال مان کر ترجمہ کیا ہے۔ آگے 'ف' عطف کا ہے۔ اَخَذَتْ، واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ کُمُ مفعول ہے اور الصّٰعِقَۃُ، اس کا فاعل۔ 'وَ' حالیہ ہے اور جملہ اسمیہ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ، حال ہے، کُمُ ضمیر کا۔

ترجمہ
البقرۃ:55

وَاِذْ قُلْتُمْ	یٰمُوْسٰی	لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ	حَتّٰی نَرَی
اور (یاد کرو) جب تم نے کہا	اے موسیٰؑ	ہم ہرگز نہیں مانیں گے آپؑ کی بات	یہاں تک کہ ہم دیکھیں

اللّٰہَ جَھْرَۃً	فَاَخَذَتْكُمُ	الصّٰعِقَۃُ	وَ	اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ
اللہ کو علانیہ	تو پکڑا تم کو	بجلی نے	اس حال میں کہ	تم دیکھ رہے تھے (اور اس کی مدافعت میں کچھ نہیں کر رہے تھے)

نوٹ مادہ ''رءی'' کی املاء اور استعمال کے متعلق چند باتیں ذہن نشین کر لیں۔

(۱) ثلاثی مجرد میں اس کا ماضی رَءٰی استعمال ہوتا ہے اور عام عربی میں اسی طرح لکھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں اسے ''ی'' کو حذف کر کے لکھا گیا ہے جیسے رَاٰ کَوْکَبًا۔

(۲) ثلاثی مجرد میں اس کا مضارع ہمزہ کو حذف کر کے یَرٰی استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں بھی اسے ''ی'' کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ البتہ ضمیر مفعولی لگاتے وقت ''ی'' کو حذف کیا گیا ہے جیسے اِنَّہٗ یَرٰىكُمْ ھُوَ وَقَبِیْلُہٗ۔

(۳) ثلاثی مجرد میں جمع متکلم کے صیغے میں مضارع مضموم نَرَیُ اور مضارع منصوب نَرَیَ، دونوں تبدیل ہو کر نَرٰی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حَتّٰی نَرٰی میں حَتّٰی کا اثر ظاہر نہیں ہوا۔

(۴) ثلاثی مجرد میں مضارع کے واحد متکلم کا وزن اَفْعَلُ ہے جبکہ باب افعال میں ماضی کے واحد مذکر غائب کا وزن اَفْعَلَ ہے۔ ان دونوں وزن میں یہ مادہ تبدیل ہو کر اَرٰی استعمال ہوتا ہے۔ جملہ کے مفہوم سے ان کا فرق پتہ چلتا ہے۔

(۵) جمع مذکر حاضر کے صیغے تَرَوْنَ کے ساتھ جب نّ ثقیلہ لگے تو تَرَوُنَّ لکھا جاتا ہے۔ لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ (التکاثر:6) اور واحد مؤنث حاضر کے صیغے تَرَیْنَ کے ساتھ جب نّ ثقیلہ لگے تو تَرَیِنَّ بنتا ہے۔ فَاِمَّا تَرَیِنَّ (مریم:26)۔ اس کا فعل امر 'رَ' ہے۔

آیت:56

﴿ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۵۶ ﴾

ب ع ث

(ف) بَعْثًا اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی کو اٹھا کر کسی طرف بھیجنا۔ اس لیے یہ اٹھانے اور بھیجنے، دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی نسبت جب انسانوں کی طرف ہو تو انہی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً کہیں گے بَعَثْتُ الْبَعِیْرَ میں نے اونٹ کو اٹھایا اور چلایا اور بَعْثُ الْاِنْسَانِ فِیْ حَاجَۃٍ کا مطلب ہوگا کسی کو کسی کام کے لیے بھیجنا۔ اس کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو

تو پھر یہ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً:

(۱) اشیاء کو عدم سے وجود میں لانا، یہ فعل اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ شاید اِن معنوں میں فعل قرآنِ مجید میں استعمال نہیں ہوا (واللّٰہ اعلم)۔

(۲) بھیجنا۔ چنانچہ رسولوں کو بھیجنے کے لیے فرمایا: ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪﴾ (2/البقرۃ:213) ''تو بھیجا اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر۔'' غیر رسول کو بھیجنے کے لیے فرمایا: ﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ﴾ (7/الاعراف:167) ''اور وہ وقت یاد کرو جب آپؐ کے پروردگار نے یہ جتلا دیا کہ وہ اِن یہود پر قیامت کے دن تک کسی ایسے کو مسلط رکھے گا جو اُنہیں سزائے شدید میں مبتلا رکھے گا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ عذاب کو بھیجنے کے لیے فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ﴾ (6/الانعام:65) ''آپؐ کہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ قدرت رکھتا ہے اِس بات پر کہ وہ تم پر بھیج دے عذاب تمہارے اوپر سے۔'' کوّے کو بھیجنے کے لیے فرمایا: ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا﴾ (5/المآئدۃ:31) ''پھر اللہ تعالیٰ نے ایک کوّے کو بھیجا۔''

(۳) مُردوں کو زندہ کرنا۔ ﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ﴾ (2/البقرۃ:259) ''تو موت دے دی اللہ نے ان کو سو سال کے لیے پھر انہیں زندہ کیا۔'' ﴿وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ﴾ (6/الانعام:36) ''اور مُردوں کو، اللہ ان کو زندہ کرے گا۔'' ﴿فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ﴾ (30/الروم:56) ''تو یہ ہے دوبارہ جی اٹھنے کا دن۔'' یہ صفت اللہ تعالیٰ کبھی اپنے خاص بندوں کو بھی عطا فرما دیتا ہے جیسے کہ حضرت عیسیٰؑ۔

(۴) نیند سے اٹھانا۔ ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ﴾ (18/الکہف:12) ''پھر ہم نے ان کو جگا دیا۔'' ﴿ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ﴾ (6/الانعام:60) ''پھر وہ تم کو جگا دیتا ہے اس (دن) میں۔''

(۵) کھڑا کرنا، جگہ دینا۔ ﴿عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝﴾ (17/بنی اسرائیل:79) ''قریب ہے کہ کھڑا کر دے تجھ کو تیرا رب مقام محمود میں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''عجب کیا کہ آپؐ کا پروردگار آپؐ کو مقام محمود میں جگہ دے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(۶) مقرر کرنا۔ ﴿وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ﴾ (5/المائدۃ:12) ''اور ہم نے انہی میں سے بارہ سردار مقرر کیے۔'' ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ﴾ (2/البقرۃ:247) ''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔''

اِبْعَثْ ج: اِبْعَثُوْا - فعل امر ہے۔ تو اٹھا۔ تو بھیج۔ ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (2/البقرہ:129) ''اے ہمارے رب! اور تو بھیج ان میں ایک رسول انہی میں سے۔'' ﴿فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ﴾ (4/النساء:35) ''تو ایک منصف اس مرد کے گھر والوں میں سے اور ایک منصف عورت کے گھر والوں میں سے مقرر کرو۔''

مَبْعُوْثٌ ج: مَبْعُوْثُوْنَ - اسم المفعول ہے۔ اٹھایا ہوا۔ بھیجا ہوا۔ ﴿ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ﴾ (17/بنی اسرائیل:49) ''کیا ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔'' ﴿وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝﴾ (6/الانعام:29) ''اور ہم اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔'' یعنی ہمیں دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔ مُردوں کے لیے اِس کا استعمال بمعنی جی اٹھنا ہے۔

(انفعال) **اِنْبِعَاثًا** اٹھنا۔ جانا۔ ﴿اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝﴾ (91/الشّمس:12) ''جب اٹھا ان میں سے زیادہ بدبخت۔'' ﴿لٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ﴾ (9/التوبۃ:46) ''لیکن ناپسند کیا اللہ نے اُن کے کھڑے ہونے کو۔''

م ر و ت: البقرۃ آیت 19 دیکھیں۔ لَعَلَّ: البقرۃ آیت 21 دیکھیں۔ ش ك ر: البقرۃ آیت 52 دیکھیں۔

ترکیب ثُمَّ حرف عطف ہے بَعَثْنَا فعل، اس میں شامل ضمیر نَحْنُ اس کا فاعل اور کُمْ اس کا مفعول ہے۔ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ متعلق فعل ہے۔ لَعَلَّ حرف مشبہ بالفعل ہے، کُمْ اس کا اسم اور جملہ فعلیہ تَشْكُرُوْنَ اس کی خبر ہے۔

ترجمہ	ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ	مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ	لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾
البقرۃ:56	پھر ہم نے اٹھایا تم کو (یعنی زندہ کیا)	تمہاری موت کے بعد	تاکہ تم شکر ادا کرو

آیت:57

﴿ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ ﴾

ظ ل ل

(س) ظَلًّا، ظُلُوْلًا (۱) ہمیشہ رہنا۔ دن کے لیے استعمال ہو جیسے ظَلَّ الیوم تو مراد ہوتی ہے دن کا سایہ دار ہونا یا سارا دن سایہ رہنا۔ (۲) ظَلَّ، یَظَلُّ، افعال ناقصہ میں سے بھی ہے۔ اِن معنوں میں اس کے معنی ہوتے ہیں دن میں کسی کام کو کرنا یا سارا دن ایک جیسی حالت رہنا۔ پھر یہ صَارَ (ہو جانا) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس وقت دن کی تخصیص نہیں رہتی۔ ان معنوں میں اس کے بعض صیغے کبھی صرف ایک لام کے ساتھ بھی لکھے جاتے ہیں۔ ﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا﴾ (16/النحل:58) ''اور جب کبھی خوشخبری دی جاتی ہے ان کے کسی ایک کو بیٹی کی تو ہو جاتا ہے اس کا چہرہ سیاہ۔'' ﴿وَانْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ؕ﴾ (20/طٰہٰ:97) ''اور تو دیکھ اپنے معبود کی طرف جس پر تو ہوا اعتکاف کرنے والا۔''

ظِلٌّ ج: ظِلَالٌ۔ اسم ذات ہے۔ (۱) سایہ۔ اس کی ضد ضِحٌّ (دھوپ) ہے۔ ہر وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچے اسے ظِلٌّ کہتے ہیں نیز ہر ڈھانپ لینے والی چیز کو بھی ظِلٌّ کہہ دیا جاتا ہے۔ (۲) عزت وحفاظت، ہر قسم کی خوشحالی۔ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ﴾ (25/الفرقان:45) ''کیا آپؐ نے دیکھا نہیں اپنے رب کی (قدرت کی) طرف کیسے اس نے پھیلایا سایہ کو۔'' ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّ عُيُوْنٍ ۙ﴾ (77/المرسلات:41) ''متقی لوگ آج سایوں اور چشموں میں ہیں۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن) ''پرہیزگار ہر طرح سے عزت وحفاظت میں ہوں گے۔'' (امام راغبؒ)

ظُلَّةٌ ج: ظُلَلٌ۔ اسم ذات ہے۔ وہ چیز جس سے سایہ کیا جائے۔ بادل۔ سائبان۔ ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ﴾ (7/الاعراف:171) ''اور جب ہم نے اٹھایا پہاڑ کو ان کے اوپر جیسے کہ وہ سائبان ہے۔'' ﴿وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ﴾ (31/لقمان:32) ''اور جب چھا جاتی ہیں ان پر موجیں سائبانوں کی طرح تو وہ پکارتے ہیں اللہ کو، خالص کرتے ہوئے اس کے لیے دین کو۔''

ظَلِيْلٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ ہمیشگی والا سایہ۔ گھنی چھاؤں۔ سایہ دینے والا۔ ﴿لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّ نُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾﴾ (4/النساء:57) ''ان کے لیے اس میں پاک جوڑے ہیں اور ہم داخل کریں گے ان کو گھنی چھاؤں میں۔'' ﴿لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾﴾ (77/المرسلات:31) ''جو دراصل نہ سایہ دینے والا ہے اور نہ شعلے سے بچا سکتا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

(تفعیل) تَظْلِیْلًا کسی پر کسی چیز کا سایہ کرنا۔امان دینا۔آیت زیرِ مطالعہ۔

غ م م

(ن) غَمًّا کسی چیز کو ڈھانپ دینا۔غمگین کرنا (یعنی خوشی کو ڈھانپ دینا)۔

غَمٌّ اسم ذات ہے۔رنج۔بے چینی۔﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ﴾(21/الانبیاء:88)''تو ہم نے سُن لی اس کی اور ہم نے نجات دی اس کو غم سے۔''

غُمَّةٌ صفت ہے۔پوشیدہ۔مُبہم۔مشتبہ۔﴿ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً﴾(10/یونس:71)''پھر نہ رہے تم کو اپنے کام میں شبہ۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)''پھر وہ تمہاری تدبیر تمہارے حق میں پوشیدہ نہ رہے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

غَمَامَةٌ ج:غَمَامٌ- اسم ذات ہے۔بادل۔کیونکہ یہ سورج کی روشنی کو ڈھانپ دیتا ہے۔آیت زیرِ مطالعہ۔

ن ز ل: البقرۃ آیت 4 دیکھیں۔

م ن ن

(ن) مَنًّا، مِنَّةً (۱) کسی پر وزن یا بوجھ ڈالنا۔اس بنیادی مفہوم سے پھر دو معانی میں استعمال ہوتا ہے۔(ا) کسی پر احسان کرنا۔(ب) احسان جتانا۔﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾(3/آل عمران:164)''اللہ نے احسان کیا ہے ایمان لانے والوں پر جب اس نے بھیجا ان میں ایک رسول انہی میں سے۔''﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ﴾(49/الحجرات:17)''وہ لوگ احسان جتاتے ہیں آپؐ پر کہ وہ اسلام لائے۔آپؐ کہیے تم احسان مت جتاؤ مجھ پر اپنے اسلام کا۔''

(۲) کم کرنا۔منقطع کرنا۔ختم کرنا۔کمزور کرنا۔

اُمْنُنْ فعل امر ہے۔تو احسان کر۔﴿هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾(38/صٓ:39)''یہ ہماری بخشش ہے۔پس تو احسان کر یا روکے رکھ کسی حساب کے بغیر۔''

مَنٌّ اسم ذات ہے۔(۱) مقررہ وزن یعنی ایک من۔(۲) احسان۔انعام۔(۳) ایک قسم کی شبنم جو پتھروں اور درختوں پر شہد کی مانند جم کر خشک ہو جاتی تھی، جسے اللہ تعالیٰ نے صحرا میں بنی اسرائیل کے کھانے کے لیے نازل کیا تھا (اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ان پر احسان تھا)۔یہ ذائقے میں میٹھی تھی۔﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ﴾(2/البقرہ:264)''اے ایمان والو! تم باطل مت کرو اپنے صدقات کو احسان سے اور تکلیف سے۔''یعنی احسان جتا کر اور تکلیف دے کر۔اور آیت زیرِ مطالعہ۔

مَمْنُوْنٌ اسم المفعول ہے۔(۱) جس پر احسان کیا گیا۔(۲) جب یہ مصدری معنی نمبر ۲ سے ہو تو مطلب ہوگا جسے ختم کیا گیا، جسے منقطع کیا گیا اور غَيْرُ مَمْنُوْنٍ کا مطلب ہوگا غَيْرُ مَقْطُوْعٍ یعنی جو ختم نہ ہو، جو منقطع نہ ہو اور بعض بزرگوں نے غَيْرُ مَمْنُوْنٍ کا ترجمہ ''بے شمار'' اور ''بغیر عمل'' بھی کیا ہے۔واللہ اعلم۔﴿لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝﴾(41/حٰمٓ السجدہ:8)''ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

مَنُوْنٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔(۱) بہت زیادہ احسان جتانے والا۔(۲) موت۔کہا جاتا ہے ذَهَبَتْ بِهِمُ الْمَنُوْنُ، موت نے ان کو تباہ کر دیا۔(۳) زمانہ۔رَيْبُ الْمَنُوْنِ۔حوادثِ زمانہ۔رَيْبٌ کا استعمال جب مَنُوْنٌ (زمانہ) کے ساتھ ہوتو اس سے گردش زمانہ یا حوادث زمانہ مراد ہوتا ہے۔کیونکہ زمانہ کی گردشوں کے تعین اوقات میں شک رہتا ہے کہ خدا جانے کب گردش کا وقت آجائے، اس لیے یہ معنی مراد لیے جاتے ہیں۔اور گردش زمانہ سے مراد ہے کسی کی اچھی حالت بری حالت سے تبدیل ہوجائے۔انسان کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ یا گردش، انسان کی موت ہوتی ہے اس لیے رَيْبُ الْمَنُوْنِ سے حادثہ موت بھی مراد لیا جاتا ہے۔حادثہ موت میں رَيْبٌ یعنی شک سے یہ مراد نہیں کہ موت واقع ہونے میں شک وشبہ ہے بلکہ اس لحاظ سے رَيْبٌ کہا جاتا ہے کہ موت کا وقت طے نہیں، اس لیے انسان تردّد میں رہتا ہے کہ نہ جانے کب موت کا وقت آجائے۔عربی زبان میں رَيْبُ الْمَنُوْنِ کا محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی شخص کسی دوسرے کے برے انجام کا منتظر ہو۔ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝۳۰﴾ (52/الطور:30) ''کیا کہتے ہیں یہ شاعر ہے ہم منتظر ہیں اُس پر گردش زمانہ کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

سَلْوٰی بٹیر کی قسم کے ایک پرندے کو سلوٰی کہتے ہیں۔امام راغبؒ نے اسے مادہ 'س ل و' کے تحت بیان کیا ہے اور فرماتے ہیں ''السّلوٰی اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے لیے تسلی کا باعث ہو۔اسی سے اَلسُّلْوَان وَالتَّسَلِّیْ ہے جس کے معنی اطمینان اور راحت کے ہیں۔(واللّٰہ اعلم)۔

ء ك ل: البقرۃ آیت 35 دیکھیں۔

ط ی ب

(ض) **طِيِّبًا** نفیس و پاکیزہ ہونا۔حلال ہونا۔کسی چیز سے دل کا خوش ہونا۔پسند ہونا۔ ﴿قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا﴾ (39/الزمر:73) ''ان سے کہا اس کے دربان نے السلام علیکم، تم پاکیزہ رہے پس تم اس (جنت) میں داخل ہوجاؤ۔'' ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (4/النساء:3) ''تو تم نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں عورتوں میں سے۔''

طُوْبٰی یہ افعل التفضیل میں واحد مونث کا صیغہ فُعْلٰی ہے۔اصل میں طُيْبٰی تھا۔'ی' 'و' میں تبدیل ہوکر طُوْبٰی بن گیا۔اس کے معنی ہوتے ہیں بہت عمدہ، بہت پاکیزہ، خوشحالی۔حضرت ابن عباسؓ کے مطابق اس کا معنی ہے ''دل کی خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک''۔حدیث شریف میں ہے کہ جنت کے ایک درخت کا نام بھی طوبیٰ ہے۔ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝۲۹﴾ (13/الرعد:29) ''جو لوگ ایمان لائے اور عمل کیے اچھے تو خوشحالی ہے ان کے لیے اور اچھا انجام ہے۔'' حدیث پاک میں ہے: طُوْبٰى لِمَنْ وَجَدَ فِيْ صَحِيْفَتِهِ اسْتِغْفَارًا كَثِيْرًا (وارے نیارے اس شخص کے جو اپنے نامہ اعمال میں زیادہ استغفار پائے) او کما قال۔

طَيِّبٌ ج: طَيِّبُوْنَ۔صفت ہے۔پاک۔پاکیزہ۔حلال۔امام راغبؒ فرماتے ہیں ''اصل میں 'طیّب' وہ چیز ہے کہ جس سے حواس لذت اُٹھائیں اور جی مزہ پائے۔'' ﴿وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ (5/المائدۃ:88) ''اور کھاؤ اُس سے جو رزق دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے حلال اور پاکیزہ۔'' ﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ﴾ (7/الاعراف:58) ''اور پاکیزہ شہر، نکلتا ہے اس کا سبزہ اس کے رب کی اجازت سے۔'' ﴿وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ﴾ (24/النور:26) ''اور پاک مرد پاک عورتوں کے لائق ہیں۔'' اور انسانوں میں ''طیّب'' وہ ہیں کہ جو جہالت اور ہ

بداعمالیوں کی نجاست سے پاک ہوں اور علم وایمان اور اعمالِ صالحہ سے آراستہ ہوں۔

طَيِّبَةٌ ج:طَيِّبَاتٌ۔طَيِّبٌ کی مونث۔ پاک۔ پاکیزہ۔ حلال۔ ﴿ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ﴾ (3/آل عمران:38)''حضرت زکریاؑ نے عرض کی اے میرے رب عطا فرما مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد'' ﴿ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ﴾ (5/المائدۃ:5)''آج حلال کر دی گئیں ہیں تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں۔'' اور آیت زیرِ مطالعہ۔

طِيْبٌ خوشبو۔قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

ر ز ق: البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔	ظ ل م: البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔	ك و ن: البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔
ن ف س: البقرۃ آیت 9 دیکھیں۔		

ترکیب

'وَ' عطف کا ہے۔ ظَلَّلْنَا فعل، اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحْنُ ہے۔ عَلَيْكُمْ متعلق فعل ہے اور اَلْغَمَامَ اس کا مفعول ہے۔ اسی طرح اَنْزَلْنَا فعل ہے اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحْنُ ہے۔ عَلَيْكُمْ تعلق فعل ہے اور اَلْمَنَّ وَالسَّلْوٰى اس کے مفعول ہیں۔ كُلُوْا فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر اَنْتُمْ ہے۔ آگے مرکب جاری مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ متعلق فعل ہے۔ اس میں طَيِّبٰتِ، مضاف ہے اور مِنْ کی وجہ سے مجرور ہے اور 'مَا' اسم موصول ہے اور جملہ فعلیہ رَزَقْنٰكُمْ اس کا صلہ ہے۔ صلہ اور موصول مل کر مضاف الیہ ہیں۔ آگے 'مَا' نافیہ ہے اور ظَلَمُوْا۔ ماضی میں جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور 'نَا' ضمیر مفعولی ہے۔ ضمیر مفعولی 'نَا' لگنے سے ظَلَمُوْا کا آخری الف گر گیا (واوَ الجمع)۔ نوٹ کر لیجئے اگر یہ ماضی کا جمع متکلم کا صیغہ ہوتا تو پھر ظَلَمْنَا آتا۔ لٰكِنْ، لٰكِنَّ کا مخفف ہے اور اس کی تفصیل آیت 12 کے آخر میں دیکھیں۔ كَانُوْآ افعال ناقصہ میں سے ہے اس کا اسم اس میں شامل ضمیر 'هُمْ' ہے اور جملہ فعلیہ يَظْلِمُوْنَ اَنْفُسَهُمْ اس کی خبر ہے۔ اَنْفُسَهُمْ، يَظْلِمُوْنَ کا مفعول ہے اور اس کو تاکید کے لیے مقدم کر دیا گیا ہے۔ كَانَ جب مضارع پر داخل ہو تو ماضی استمراری کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ البقرۃ:57

وَظَلَّلْنَا	عَلَيْكُمُ	الْغَمَامَ	وَاَنْزَلْنَا	عَلَيْكُمُ
اور ہم نے سایہ فگن کیا	تم پر	بادلوں کو	اور ہم نے اتارا	تم پر

الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى	كُلُوْا	مِنْ طَيِّبٰتِ مَا	رَزَقْنٰكُمْ
من اور سلویٰ	تم کھاؤ	اس کے پاکیزہ سے جو	ہم نے عطا کیا تم کو

وَمَا ظَلَمُوْنَا	وَلٰكِنْ	كَانُوْآ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٥٧﴾
اور انہوں نے ظلم نہیں کیا ہم پر	اور لیکن (بلکہ)	وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کیا کرتے تھے

نوٹ

آسان عربی گرامر (ازلطف الرحمٰن خان صاحب) میں آپ كَانَ اور لَيْسَ پڑھ چکے ہیں۔ یہ جب جملہ اسمیہ پر داخل ہوتے ہیں تو خبر کو نصب دیتے ہیں۔ خبر کو نصب دینے والے تقریباً گیارہ مزید افعال ناقصہ عربی میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف ظَلَّ، اَصْبَحَ، مَا زَالَ، مَا دَامَ، مَا بَرِحَ اور مَا فَتِئَ قرآنِ مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں سے ظَلَّ کی تفصیل آپ آیت زیرِ مطالعہ میں پڑھ چکے ہیں۔ باقی افعال کی مختصر سی تفصیل درج ذیل ہے اور یہ بات بھی دوبارہ یاد کر لیجئے کہ اِن افعال میں سے لَيْسَ اور مَا دَامَ کے صرف ماضی کے صیغے استعمال ہوتے ہیں اور باقی تمام کے ماضی اور مضارع دونوں استعمال ہوتے ہیں۔

اَصْبَحَ۔ یُصْبِحُ (باب افعال) میں اصل مفہوم ہے، صبح کے وقت ہو جانا لیکن پھر زیادہ تر صرف ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ﴿فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا﴾ (3/آل عمران:103) ''پھر اس نے الفت پیدا کی تمہارے دلوں کے مابین تو تم ہو گئے اس کی نعمت سے بھائی بھائی۔'' ﴿فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ﴾ (49/الحجرات:6) ''تو تم ہو جاؤ گے اس پر جو تم نے کیا ندامت کرنے والے۔'' کَانَ کی طرح اَصْبَحَ بھی ''تامّہ'' ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کے معنی ہوتے ہیں ''صبح کرنا'' یا ''صبح کے وقت آنا'' مثلاً کہیں گے اَصْبَحْنَا بِالْخَیْرِ ہم نے خیریت سے صبح کی۔ اَصْبَحَ عَلَیْهِمُ الطُّوْفَانُ، صبح کے وقت ان پر طوفان آیا۔ قرآنِ مجید میں فرمایا: ﴿فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَةِ﴾ (28/القصص:18) ''پھر اس نے (یعنی حضرت موسیٰؑ نے) صبح کی شہر میں۔'' ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ﴾ (30/الروم:17) ''سو پاکی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو۔''

زَالَ۔ یَزَالُ (ف) کے معنی ہیں زائل ہونا۔ اس سے پہلے جب مَا نافیہ یا لَا لگتا ہے تو معنی ہوتے ہیں زائل نہ ہونا۔ پھر یہ 'ہمیشہ ہونے' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ﴿فَمَا زِلْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ﴾ (40/مومن:34) ''تو تم ہمیشہ شک میں رہے اس سے جو وہ لایا تمہارے پاس۔'' ﴿وَ لَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى یَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِیْنِكُمْ﴾ (2/البقرہ:217) ''اور وہ ہمیشہ قتال کرتے رہیں گے تم سے یہاں تک کہ وہ پھیر دیں تم کو تمہارے دین سے۔''

مَادَامَ میں اصل فعل دَامَ ہے جس کے معنی ہیں ہمیشہ کے لیے ہو جانا یا رہنا اس کے ساتھ جو مَا لگا ہے۔ یہ مَا ظرفیہ ہے یعنی اس میں ظرف (وقت) کا مفہوم ہے جس کے معنی ہیں ''جب تک۔'' اس طرح مَادَامَ کا مطلب ہو جاتا ہے ''وہ جب تک رہا۔'' ﴿وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا﴾ (19/مریم:31) ''اور اس نے مجھے تاکید کی نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک میں رہوں زندہ۔''

بَرِحَ۔ یَبْرَحُ (س) اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کو چھوڑ دینا یا کسی جگہ سے ہٹ جانا۔ جب اس کے ساتھ 'لَا' یا 'لَنْ' لگتا ہے تو نفی پیدا ہو جاتی ہے یعنی کسی چیز کو نہ چھوڑنا یا کسی جگہ سے نہ ہٹنا۔ اس طرح اس میں ہمیشگی کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ہمیشہ حَتّٰی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً فرمایا: ﴿قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰكِفِیْنَ حَتّٰى یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰى﴾ (20/طٰہٰ:91) ''قوم نے کہا ہم تو اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے یہاں تک کہ لوٹ آئیں ہماری طرف موسیٰؑ۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

فَتِئَ۔ یَفْتَأُ (س، ف) اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی کو کسی کام سے روکنا۔ جب اس کے ساتھ 'لَا' یا 'مَا' نافیہ لگتا ہے تو مطلب ہوتا ہے کسی کو کسی کام سے نہ روکنا۔ اس سے ہمیشگی کا مفہوم پیدا ہوتا ہے یعنی وہ ہمیشہ کرتا رہا یا کرتا رہے گا۔ قرآنِ مجید میں یہ فعل، افعال ناقصہ کی صورت میں صرف ایک مرتبہ سورہ یوسف کی آیت 85 میں استعمال ہوا ہے اور وہاں بھی 'لَا' محذوف ہے۔ ﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ یُوْسُفَ﴾ (12/یوسف:85) ''انہوں نے کہا اللہ کی قسم آپؑ ہمیشہ کرتے رہیں گے یوسفؑ کا تذکرہ۔'' (واللہ اعلم)۔

افعال ناقصہ کی مزید تفصیل عربی کا معلّم، حصہ سوم سے ایک نظر دیکھ لیں۔

آیت:58

﴿وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰیٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ﴾

اِذْ: البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔ ق و ل: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

د خ ل

(ن) دُخُوْلًا داخل ہونا (لازم)۔ اس کی ضد خروج (نکلنا) ہے۔ یہ لفظ ظاہری اور معنوی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً فرمایا:

﴿فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ﴾ (3/آل عمران:97) ''اس میں واضح نشانیاں ہیں، ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے اور جو داخل ہوا اس میں وہ ہے امن میں ہونے والا۔'' ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (49/الحجرات:14) ''اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔'' اس کے ساتھ جب عَلٰی کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کسی کی خدمت میں حاضر ہونا، کسی کی زیارت کرنا، یا کسی پر حملہ کرنا۔ مثلاً فرمایا: ﴿وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ﴾ (12/یوسف:58) ''اور ایک روز آ نکلے برادرانِ یوسفؑ اور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ﴿قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ﴾ (5/المائدۃ:23) ''کہاں دو مردوں نے اللہ سے ڈرنے والوں میں سے کہ خدا کی نوازش تھی ان دو پر گھس جاؤ ان پر حملہ کر کے دروازہ میں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ اِس صورت میں اس کا فعل مجہول بھی استعمال ہو جاتا ہے مثلاً فرمایا: ﴿وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا﴾ (33/الاحزاب:14) ''اور اگر مدینے کے اطراف سے ان پر (لشکر) داخل کیے جاتے۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔ لیکن اکثر بزرگوں نے آیت میں دُخِلَتْ کا ترجمہ فعل معروف کے لحاظ سے کیا ہے۔ مثلاً ''اور اگر شہر میں کوئی گھس آئے ان پر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)، ''اور اگر ان (لوگوں) پر (مدینہ کے) اطراف سے کوئی (لشکر کافروں کا) آ گھسے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)، ''اگر گھس آتے (کفار کے لشکر) ان پر مدینہ کے اطراف سے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ (واللہ اعلم)۔ اس کے ساتھ 'ب' کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے داخل کرنا اور دَخَلَ بِامْرَءَتِهٖ، کنایۃً بیوی سے ہم بستری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا: ﴿وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ز فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ (4/النساء:23) ''اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں اُن بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو اور اگر تم نے صحبت نہ کی ہو ان بیویوں سے تو کوئی حرج نہیں تم پر (ان کی بیٹیوں سے نکاح کرنے میں)۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

اُدْخُلْ ج: اُدْخُلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو داخل ہو۔ ﴿قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ﴾ (36/یٰسٓ:26) ''کہا گیا تو داخل ہو جا جنت میں۔'' ﴿وَقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝۱۰﴾ (66/التحریم:10) ''اور کہا گیا تم دونوں داخل ہو آگ میں، داخل ہونے والوں کے ساتھ۔'' اور آیت زیر مطالعہ۔

دَاخِلٌ ج: دَاخِلُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ داخل ہونے والا۔ اوپر آیت نمبر (66/التحریم:10) دیکھیں۔ ﴿فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝۲۲﴾ (5/المائدۃ:22) ''پھر اگر وہ وہاں سے نکل گئے، تو ہم داخل ہوں گے۔''

(س) **دَخَلًا** عقل یا جسم میں خرابی داخل ہونا۔

دَخَلٌ اسم ذات ہے۔ عقلی یا جسمانی خرابی۔ فساد۔ چُھپی ہوئی دشمنی۔ فریب۔ خاندانی عیب یعنی وہ لوگ جو اپنے آپ کو کسی کی جانب منسوب کرتے ہوں اور فی الحقیقت ان میں سے نہ ہوں۔ ﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ﴾ (16/النحل:94) ''اور اپنی قسموں کو باہمی فساد کا ذریعہ نہ بناؤ۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ''اور نہ بناؤ اپنی قسموں کو آپس میں فریب دینے کا ذریعہ۔'' (ترجمہ ضیاء القران)۔

(افعال) **اِدْخَالًا** داخل کرنا۔ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ﴾ (4/النساء:57) ''اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل کیے بھلے، ہم داخل کریں گے ان کو باغات میں۔''

اُدْخِلْ ج: اُدْخِلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو داخل کر۔ ﴿وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۹﴾ (27/النمل:19) ''اور تو

داخل کر مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں۔'' ﴿اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝﴾ (40/مومن:46) ''تم داخل کر دو فرعونیوں کو سخت ترین عذاب میں۔''

مُدْخَلٌ اسم المفعول ہے جو ظرف کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ داخل کیا ہوا یا داخل کرنے کی جگہ۔ ﴿نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝﴾ (4/النساء:31) ''تو ہم دور کریں گے تم سے تمہاری برائیوں کو اور ہم داخل کریں گے تم کو باعزت داخل کرنے کی جگہ میں۔''

(افتعال) اِدِّخَالًا کسی جگہ مشقت سے داخل ہونا۔ گھسنا۔

مُدَّخَلٌ اسم المفعول جو بطور ظرف استعمال ہوتا ہے۔ گھسنے کی جگہ۔ ﴿لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا﴾ (9/التوبہ:57) ''اگر وہ لوگ پائیں کوئی پناہ گاہ یا کوئی غار یا کوئی گھسنے کی جگہ۔''

ق ر ی

(ض) قَرًی اور قَرْیًا جمع کرنا۔ کہتے ہیں قَرَیْتُ الْمَاءَ فِی الْحَوْضِ۔ میں نے حوض میں پانی جمع کر دیا۔

قَرْیَةٌ ج: قُرًی۔ جب لام تعریف داخل ہو تو اَلْقُرٰی۔ اسم ذات ہے۔ جہاں انسان جمع ہو کر آباد ہو جائیں۔ اس مفہوم میں یہ لفظ بستی اور بستی والوں، دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ﴾ (4/النساء:75) ''اے ہمارے رب تو نکال ہم کو اس بستی سے۔'' ﴿وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِيْهَا﴾ (12/یوسف:82) ''اور آپؐ پوچھ لیجئے اس بستی والوں سے جس میں ہم تھے۔'' ﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِیْ قُرًی مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ﴾ (59/الحشر:14) ''یہ لوگ نہیں لڑیں گے تم سے جم کر مگر قلعہ بند شہروں میں یا دیواروں کے پیچھے سے۔'' ﴿وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا﴾ (18/الکہف:59) ''اور یہ بستیوں والے، ہم نے ہلاک کیا ان کو جب انہوں نے ظلم کیا۔'' ﴿وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ﴾ (6/الانعام:92) ''اور تا کہ آپؐ ڈرائیں مکہ والوں کو اور جو اُس کے اردگرد ہیں۔'' اُمُّ الْقُرٰی: مکہ معظّمہ کا دوسرا نام ہے۔ ام القری کے معنی بستیوں کی اصل اور جڑ کے ہیں۔ یا مرکزی بستی کے۔ مکہ معظّمہ چونکہ ساری دنیا کا دینی مرکز ہے۔ تمام روئے زمین پر خدا کا پہلا گھر وہیں بنا۔ اور قبلۂ اول ہونے کا شرف اسی کو حاصل ہوا۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی تمام عرب کا دینی و دنیوی مرجع تھا اور آج بھی نہ صرف عرب بلکہ تمام عالمِ اسلامی کا۔ ان وجوہ سے قرآن مجید نے مکہ معظّمہ کو ام القری کہا ہے۔ (لغات القرآن، ج۱، ص ۲۳۷)

ء ك ل: البقرۃ آیت 35 دیکھیں۔ حَيْثُ: البقرۃ آیت 35 دیکھیں۔ ش ی ء: البقرۃ آیت 20 دیکھیں۔
ر غ د: البقرۃ آیت 35 دیکھیں۔

بَابٌ ج: اَبْوَابٌ۔ دروازہ۔

س ج د: البقرۃ آیت 34 دیکھیں۔

ح ط ط

(ن) حَطًّا اترنا۔ نازل ہونا۔ (لازم)۔ کسی چیز کو اوپر سے نیچے اتارنا یا کسی کا بوجھ اتارنا (متعدی)۔ کہا جاتا ہے حَطَطْتُ الرَّحْلَ میں نے سواری سے پالان اتار کر نیچے رکھ دیا۔

(استفعال) اِسْتِحْطَاطًا بوجھ اتارنے کی درخواست کرنا۔

حِطَّةٌ اسم ذات ہے۔ بوجھ اتارنے کی درخواست یا دعا۔ قرآن مجید میں یہ لفظ گناہوں کا بوجھ اتارنے کی دعا کے لیے آیا ہے ۔آیت زیر مطالعہ۔ اس سے مراد ہے حُطَّ عَنَّا ذُنُوْبَنَا یعنی اے اللہ ہمارے گناہ ہم سے اتار دے اور بعض بزرگوں نے اس سے مراد لی ہے قُوْلُوْا صَوَابًا یعنی صحیح بات کہنا۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''حِطَّةٌ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جانا، دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتلِ عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں درگزر اور عام معافی کا علان کرتے جانا'' اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''قُوْلُوْا حِطَّةٌ سے یہ مراد نہیں کہ بعینہٖ لفظ حِطَّةٌ کا تلفظ ادا کرتے جاؤ۔ یہ لفظ تو عربی ہے، اور اسرائیلیوں کی زبان عربی نہیں۔ عبرانی تھی۔ مراد یہ ہے کہ انہیں زبان سے بھی کلمات توبہ واستغفار ادا کرتے رہنے کا حکم ملا تھا۔''

غ	ف	ر

(ض) غَفْرًا اور غُفْرَانًا اس کا بنیادی مفہوم ہے ڈھانپ دینا، چھپا دینا۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ غَفَرَ کے معنی ہیں کسی چیز پر کوئی ایسی چیز پہنا دینا جو اسے میل کچیل اور دوسری نقصان دہ چیزوں سے محفوظ رکھے۔ چنانچہ عربی میں کہتے ہیں اِغْفِرْ ثَوْبَكَ فِي الْوِعَاءِ اپنے کپڑوں کو تھیلے وغیرہ میں ڈال کر چھپا دو۔ اسی طرح کہتے ہیں غَفَرَ الشبابَ بالخضابِ اس نے خضاب سے بالوں کی سفیدی کو چھپا دیا۔ اَلْمِغْفَرُ لوہے کے خَود (لوہے کی ٹوپی) کو کہتے ہیں جو دوران جنگ سپاہی سر پر پہن لیتے ہیں جس سے سر دشمن کے وار سے محفوظ رہتا ہے۔ اَلْغِفَارَةُ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے عورتیں اپنے ڈوپٹے کو تیل سے بچانے کے لیے اس کے نیچے سر پر اوڑھ لیتی ہیں اور اس کپڑے کو بھی کہتے ہیں جس سے کمان کے گوشے کو لپیٹتے ہیں اور اس بادل کو بھی جو دوسرے بادل پر چھایا ہوا ہو۔ اِن تمام بنیادی مفاہیم کے ساتھ یہ لفظ جب قرآن وسنت میں اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا بندے کے گناہوں کو چھپا دینا، ڈھانپ دینا یا بندے کو گناہوں کی سزا سے محفوظ رکھنا۔ پھر اردو میں اس کا ترجمہ معاف کر دینا اور بخش دینا سے کیا جاتا ہے۔ ﴿وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (3/آل عمران:135) ''اور کون بخشتا ہے گناہوں کو اللہ کے سوا'' یہ لفظ بندوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً فرمایا: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (42/الشوریٰ:43) ''اور بے شک جس نے صبر کیا اور معاف کیا تو یقیناً یہ حوصلے کے کاموں میں سے ہے۔'' کبھی یہ لفظ ظاہری طور پر درگزر کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے چاہے دل سے معاف نہ بھی کیا جائے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ﴾ (45/الجاثیہ:14) ''آپؐ کہیے ان لوگوں سے جو ایمان لائے کہ وہ لوگ درگزر کریں ان سے جو امید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی یعنی بدلے کے دن کی۔''

اِغْفِرْ فعل امر ہے۔ تو بخش دے۔ تو درگزر کر۔ ﴿رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ﴾ (23/المؤمنون:118) ''اے میرے رب تو بخش دے اور تو رحم فرما۔''

غَافِرُ ج: غَافِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ معاف کرنے والا۔ ﴿غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ﴾ (40/المؤمن:3) ''معاف کرنے والا گناہ کا اور قبول کرنے والا توبہ کا۔''

غَفُوْرٌ اسم المبالغہ ہے۔ بہت زیادہ یعنی دل کھول کر بخشنے والا۔ یہ اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (2/البقرہ:173) ''بے انتہا بخشنے والا ہے ہر حال میں رحم کرنے والا ہے۔''

غَفَّارٌ اسم المبالغہ ہے۔ کثرت سے یعنی بار بار بخشنے والا۔ یہ بھی اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔﴿ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ (20/طٰہٰ:82) ''اور یقیناً میں کثرت سے بخشنے والا ہوں اس کو جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور عمل کیے نیک پھر اس نے ہدایت پائی۔''

مَغْفِرَةٌ اسم ذات ہے۔ معافی۔ بخشش۔﴿ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ ﴾ (2/البقرہ:221) ''اور اللہ بلاتا ہے جنت اور مغفرت کی طرف۔''

(استفعال) اِسْتِغْفَارًا قول اور عمل سے معافی مانگنا۔ قول اور عمل سے بخشش طلب کرنا۔ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہوتی ہے چاہے اللہ کا نام مذکور ہو یا نہ ہو۔ جس سے معافی مانگی جائے وہ مفعول بنفسہٖ آتا ہے۔ جس کے لیے معافی مانگی جائے اس پر لام کا صلہ آتا ہے اور جس غلطی یا گناہ کی معافی مانگی جائے اس پر کبھی لام کا صلہ آتا ہے اور کبھی نہیں۔﴿ لَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ (27/النمل:46) ''تم لوگ کیوں نہیں بخشش مانگتے اللہ سے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' ﴿ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ﴾ (3/آل عمران:135) ''پھر انہوں نے معافی مانگی اپنے گناہوں کی۔'' ﴿ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ﴾ (12/یوسف:98) ''عنقریب میں بخشش طلب کروں گا تمہارے لیے اپنے رب سے۔''

اِسْتَغْفِرْ ج: اِسْتَغْفِرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو معافی مانگ۔﴿ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ﴾ (3/آل عمران:159) ''اور آپ ﷺ مغفرت طلب کریں ان کے لیے اور مشورہ کریں ان سے فیصلوں میں۔''

مُسْتَغْفِرٌ ج: مُسْتَغْفِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ معافی مانگنے والا۔﴿ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴾ (3/آل عمران:17) ''اور بخشش طلب کرنے والے راتوں کے پچھلے پہر میں۔''

خ ط ء

(س) (ا) خِطْأً اور خِطْأَةً قصد و ارادے کے ساتھ غلطی کرنا۔ گناہ کرنا۔ یہ قابل گرفت ہے۔ قرآنِ مجید میں فعل استعمال نہیں ہوا۔

(ب) خَطَأً بنیادی مفہوم ہے صحیح راہ سے ہٹ جانا۔ چوک جانا۔ بغیر قصد اور ارادے کے غلطی کرنا۔ یہ (آخرت کے اعتبار سے) قابل گرفت نہیں۔ قرآن مجید میں فعل استعمال نہیں ہوا ہے۔

خَطِيْٓئَةٌ ج: خَطِيْٓئَاتٌ اور خَطَايَا۔ اسم ذات ہے۔ اس کا مطلب قریب قریب سَيِّئَةٌ کی طرح ہے۔ غلطی۔ گناہ۔ چاہے ارادہ اور قصد سے ہو یا بغیر ارادے اور قصد کے۔﴿ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴾ (2/البقرہ:81) ''جس نے کمائی کوئی برائی اور اس کو گھیر لیا اس کی غلطی نے تو وہ لوگ آگ والے ہیں۔'' ﴿ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ﴾ (4/النساء:112) ''اور جس نے کمائی کوئی خطا یا کوئی گناہ۔'' امام راغبؒ فرماتے ہیں اس آیت میں خَطِيْٓئَةً سے مراد وہ فعل ہے جو بلا قصد ہوا ہو۔ اور اسی قسم کی خطا کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا﴿ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴾ (26/الشعراء:82) ''اور وہ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخش دے گا۔'' ﴿ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓئٰتِكُمْ ﴾

(7/الاعراف:161) ''اور تم لوگ داخل ہو دروازے میں سجدہ کرنے والے ہوتے ہوئے تو ہم بخش دیں گے تمہاری خطاؤں کو۔'' ﴿ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا ﴾(20/طٰہٰ:73) ''بے شک ہم ایمان لائے اپنے رب پر تاکہ وہ بخش دے ہمارے لیے ہماری خطاؤں کو۔'' اور آیت زیر مطالعہ۔

خِطْأٌ اسم ذات بھی ہے۔ قصد و ارادے کے ساتھ کیا ہوا گناہ یا غلطی۔ یہ قابل گرفت ہے۔ ﴿ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴾(17/بنی اسرائیل:31) ''ہم رزق دیتے ہیں ان کو بھی اور تم کو بھی بے شک ان کو قتل کرنا بڑی غلطی ہے۔''

خَطَأٌ اسم ذات بھی ہے۔ بغیر ارادے اور قصد سے کیا ہوا گناہ یا غلطی۔ ﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ ﴾ (4/النساء:92) ''اور نہیں ہے جائز کسی مومن کے لیے کہ وہ قتل کرے کسی مومن کو مگر بلا ارادہ غلطی سے۔'' اسی قسم کی خطا کے متعلق آنحضرتؐ نے فرمایا رُفِعَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ کہ میری امت سے خطا اور نسیان اٹھا لیے گئے ہیں۔

خَاطِئٌ ج: خَاطِئُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مذکر۔ جان بوجھ کر غلطی کرنے والا۔ گناہ گار۔ ﴿ يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴾ (12/یوسف:97) ''اے ہمارے والد آپؑ بخشش طلب کریں ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی بے شک ہم غلطی کرنے والے تھے۔''

خَاطِئَةٌ اسم الفاعل ہے۔ واحد مؤنث۔ جان بوجھ کر غلطی کرنے والی۔ گناہگار۔ ﴿ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ ﴾ (96/العلق:16) ''وہ پیشانی جو جھوٹی اور خطا کار ہے۔'' کبھی خَاطِئَةٌ کا اطلاق ''گناہ'' کے لیے بھی ہوجاتا ہے۔ مثلاً فرمایا: ﴿ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۚ ﴾ (69/الحاقۃ:9) ''اور الٹی ہوئی بستیوں والوں نے (بڑے بڑے) قصور کئے تھے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں اَلْخَاطِئَةُ: اَلذَّنْبُ الْعَظِيْمُ۔ بہت بڑا گناہ۔

(افعال) **اِخْطَاءً** بلا ارادہ غلطی کرنا۔ چوک جانا۔ ﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ ﴾(33/الاحزاب:5) ''اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس میں جس میں تم چوک گئے۔'' اور حدیث پاک میں ہے مَنِ اجْتَهَدَ فَاَخْطَأَ فَلَهٗ اَجْرٌ جس نے اجتہاد کیا، لیکن اس سے غلطی ہوگئی اسے پھر بھی اجر ملے گا۔ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

مُخْطِئٌ اسم الفاعل ہے۔ مخطی اُسے کہا جاتا ہے جو نیکی کا ارادہ کرے لیکن اُس سے غلطی ہوجائے۔

ز ی د: البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔

ح س ن

(ک) (ن) **حَسُنَ** پسندیدہ ہونا، خوبصورت ہونا، اچھا یا بھلا ہونا۔ ﴿ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴾(4/النساء:69) ''اور اچھے ہوئے وہ لوگ بطور ساتھی کے۔''

حُسْنٌ اسم ذات ہے۔ خوبصورتی۔ اچھائی۔ بھلائی۔ نوٹ کر لیجئے یہ لفظ اسم ذات ہے اس لیے بطور صفت نہیں آسکتا کیونکہ اسم ذات صفت نہیں بنتے۔ ﴿ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴾(3/آل عمران:195) ''اور اللہ، اس کے پاس ثواب کی خوبصورتی یعنی بہترین بدلہ ہے۔''

حَسَنٌ ج: حِسَانٌ۔ مؤنث: حَسَنَةٌ وَ حَسْنَآءُ۔ ج: حَسَنَاتٌ اور حِسَانٌ۔ اسم صفت ہے۔ خوبصورت۔ حسین۔ اچھا۔ عمدہ۔ اس سے مراد ہر وہ نعمت ہے جو انسان کو حاصل ہو کر اس کی مسرت کا سبب بنے۔ یہ لفظ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے۔ ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (2/البقرہ:245) ''کون ہے جو قرض دے اللہ کو ایک خوبصورت قرض۔'' ﴿مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا﴾ (4/النساء:85) ''جو سفارش کرے کوئی اچھی سفارش کی تو اس کے لیے ہے ایک حصہ اس میں سے۔'' ﴿فِیْهِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ﴾ (55/الرحمٰن:70) ''ان میں اچھی سیرت والیاں، اچھی صورت والیاں ہوں گی۔'' ﴿مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ﴾ (55/الرحمٰن:76) ''سبز مسندوں اور عمدہ فرشوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔

نوٹ ۱: حِسَانٌ، حَسَنٌ کی بھی جمع ہے اور حَسَنَةٌ وَ حَسْنَآءُ کی بھی جمع ہے۔ چنانچہ الرحمن:70 میں یہ ایک مونث لفظ (خَیْرَاتٌ) کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے اور آیت 76 میں ایک مذکر لفظ (عَبْقَرِیٍّ) کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

نوٹ ۲: حَسَنَةٌ اور اس کی جمع حَسَنَاتٌ صفت کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں جیسے شَفَاعَةٌ حَسَنَةٌ، مَوْعِظَةٌ حَسَنَةٌ، اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ وغیرہ اور بطور اسم ذات بھی استعمال ہوتے ہیں اس صورت میں اس کے معنی ہوتے ہیں، نیکی، بھلائی، خوبی، نعمت وغیرہ۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں فرمایا: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ (2/البقرۃ:201) ''اے ہمارے رب عطا فرما ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن) ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ (11/ھود:114) ''بے شک نیکیاں مٹا دیتی ہیں برائیوں کو۔'' حَسَنَةٌ کی ضد سَیِّئَةٌ آتی ہے جیسے فرمایا: ﴿اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِهَا﴾ (3/آل عمران:120) ''اگر پہنچے تمہیں کوئی بھلائی تو بری لگتی ہے اُنہیں اور اگر پہنچے تمہیں کوئی تکلیف تو (بڑے) خوش ہوتے ہیں اُس سے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

اَحْسَنُ مؤنث: حُسْنٰی۔ اسم التفضیل ہے۔ زیادہ اچھا یا سب سے اچھا۔ ﴿وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ (2/البقرہ:138) ''اور کون زیادہ اچھا ہے اللہ سے بلحاظ رنگ کے۔'' ﴿وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ﴾ بِمَا صَبَرُوْا﴾ (7/الاعراف:137) ''اور پورا ہوا تیرے رب کا سب سے اچھا فرمان بنی اسرائیل پر بسبب اس کے جو انہوں نے صبر کیا۔'' ﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ﴾ (9/التوبۃ:52) ''آپؐ یہ بھی کہہ دیجئے تم تو ہمارے حق میں دو بھلائیوں ہی میں سے ایک (بھلائی) کے منتظر رہتے ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ آیت میں حُسْنَیَیْنِ، حُسْنٰی کا تثنیہ ہے۔ اور اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (سب سے اچھے نام) سے مراد ہیں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ صفاتی نام۔ قرآنِ مجید میں فرمایا: ﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی﴾ (17/بنی اسرائیل:110) ''کہہ دیجئے کہ اللہ کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو تمام اچھے نام اسی کے ہیں۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔

(افعال) اِحْسَانًا اس کے اصل لغوی معنی ہیں ''کسی کام کو حسن وخوبی کے ساتھ کرنا''۔اس کی پھر دو قسمیں ہیں (1) کسی کام کو اپنی ذات میں اچھا اور مکمل کرنا۔اپنے فعل میں حسن پیدا کرنا اور یہ چیز حسنِ علم اور حسنِ عمل سے پیدا ہوتی ہے۔(2) بندوں کے حقوق حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرنا، ان سے حسن سلوک کرنا اور ان پر انعام کرنا۔ان معنوں میں عموماً اِلٰی کا صلا استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ﴾ (28/القصص:77) ''اور احسان کیا کر (غریبوں پر) جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔اردو زبان میں احسان کا لفظ عام طور پر اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔کسی شخص کے عمل میں جب احسان کی یہ دونوں قسمیں جمع ہوتی ہیں تب اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان بذاتِ خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہتا ہے۔ایک طرف تو اس کی عبادت میں حسن اور اخلاص پیدا ہوتا ہے۔وہ اللہ کی عبادت یوں کرتا ہے کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے یا کم از کم اسے یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔یہی وہ چیز ہے جس کی وضاحت حدیث جبرئیلؑ میں بیان ہوئی ہے۔حضورؐ نے فرمایا: اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (صحیح بخاری) ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی ایسی بندگی کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر یہ درجہ نصیب نہ ہو تو اتنی بات کا یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔'' اسے یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ اس کی بھلائی کا صلہ بھلائی ہی کی صورت میں ملے گا۔آدمی فرائض سے بڑھ کر نوافل ادا کرتا ہے اس کے اعمال اور اخلاق بہترین ہو جاتے ہیں۔اور دوسری طرف اس کے اردگرد انسان ہوں یا حیوان سب اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔بندوں سے معاملات کرتے وقت ایسا شخص عدل وانصاف سے بلند ہو کر فضل اور عفو کو اختیار کرتا ہے۔کسی مزدور کو مزدوری دیتے وقت طے شدہ رقم سے زیادہ ادا کرتا ہے۔کسی سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو درگزر کرتا ہے۔حیوانات تک ایسے شخص سے فائدہ اٹھاتے ہیں چنانچہ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: جس شخص کے گھر میں اس کی بلی کو اس کی خوراک اور ضروریات نہ ملیں اور جس کے پنجرے میں بند پرندوں کی پوری خبر گیری نہ ہوتی ہو وہ کتنی ہی عبادت کرے محسنین میں شمار نہیں ہوگا۔(بحوالہ معارف القرآن، ج۵،ص۳۹۱)۔قرآنِ مجید میں سے مثالیں: ﴿اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۚ﴾ (18/الکہف:30) ''بے شک ہم ضائع نہیں کرتے اس کے اجر کو جو عمدہ (اور مفید) کام کرتا ہے۔'' ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ﴾ (5/الاعراف:93) ''جبکہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے اور عمل کیے بھلائیوں والے پھر انہوں نے (مزید) تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے پھر انہوں نے (اور) تقویٰ اختیار کیا اور درجۂ احسان کو پہنچے۔''

عدل اور احسان میں فرق: قرآن مجید میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ﴾ (16/النحل:90) ''بے شک اللہ تعالیٰ تم کو عدل اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔'' امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''احسان عدل سے بڑھ کر چیز ہے کیونکہ دوسرے کا حق پورا ادا کر دینا اور اپنا حق پورا لے لینے کا نام عدل ہے لیکن احسان یہ ہے کہ دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دیا جائے اور اپنے حق سے کم لیا جائے لہٰذا احسان کا درجہ عدل سے بڑھ کر ہے۔'' (مفردات القرآن، ج۱،ص۲۳۷)۔اور حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''عدل تو یہ ہے کہ دوسرے کا حق پورا پورا اس کو دے دے اور اپنا وصول کر لے، نہ کم نہ زیادہ، اور کوئی تکلیف تمہیں پہنچائے تو ٹھیک اتنی ہی تکلیف تم اس کو پہنچاؤ نہ کم نہ زیادہ، اور احسان یہ ہے کہ دوسرے کو اس کے اصل حق سے زیادہ دو اور خود اپنے حق میں چشم پوشی سے کام لو، کہ کچھ کم ہو جائے تو بخوشی قبول کر لو، اسی طرح دوسرا کوئی تمہیں ہاتھ یا زبان سے ایذا پہنچائے تو تم برابر کا انتقام لینے کے بجائے اس کو

معاف کردو، بلکہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دو اسی طرح عدل کا حکم تو فرض واجب کے درجہ میں ہوا اور احسان کا حکم نفلی اور تبرع کے طور پر ہوا۔'' (معارف القرآن، ج۵،ص۳۹۱)۔عدل سے بھی معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے لیکن احسان سے مزید خوشگواری اور اپنائیت کے جذبات نشوونما پاتے ہیں۔

ہر چیز میں احسان کا حکم: اسلام میں ہر چیز میں احسان یعنی حسن وخوبی کے ساتھ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرانِ مجید میں سورہ النحل کی آیت 90 آپ نے پڑھ لی اب صحیح مسلم کی یہ حدیث مبارک دیکھیے، فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَ وَلْيُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهٗ وَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهٗ (مسلم) ''اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے سلسلے میں 'احسان' تم پر فرض کیا ہے، تو جب قتل کرو تو اچھی طرح قتل کرو اور جب ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو اور اپنی چھری تیز کرو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔''

احسان کا بدلہ احسان: قرآنِ مجید میں فرمایا: ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۚ﴾ (55/الرحمٰن:60) ''احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہے۔'' اس آیت میں پہلے احسان سے مراد ہے حسنِ عبادت اور حسنِ معاملات اور دوسرے احسان سے مراد ہے اس کا صلہ یعنی جنت اور اس کی نعمتیں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس آیت کا ترجمہ نہایت خوب صورت انداز سے کیا ہے فرماتے ہیں: ''بھلا کمال اطاعت کا بدلہ بجز کمال عنایت کے کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔''

مُحْسِنٌ ج: مُحْسِنُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ درجۂ احسان پر کام کرنے والا یعنی ہر عمل کو اچھے اور بہترین طریقے سے کرنے والا۔ پورے خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا، جیسے حدیث مبارک میں احسان کی تعریف کی گئی ہے۔ نیکیاں کرنے والا۔ لوگوں سے حسن سلوک کرنے والا۔ ﴿بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪﴾ (2/البقرۃ:112) ''کیوں نہیں جس نے تابع کر دیا منہ اپنا اللہ کے اور وہ نیک کام کرنے والا ہے تو اس کے لیے ہے ثواب اس کا اپنے رب کے پاس۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۹۵﴾ (2/البقرہ:195) ''بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

مُحْسِنَةٌ ج: مُحْسِنَاتٌ۔ مُحْسِنٌ کی مؤنث۔ درجہ احسان پر کام کرنے والی۔ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۲۹﴾ (33/الاحزاب:29) ''تو بے شک اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھا ہے تم میں سے نیک کام کرنے والیوں کے لیے اجر عظیم۔''

اَحْسِنْ ج: اَحْسِنُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو احسان کر۔ ﴿وَاَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ﴾ (28/القصص:77) ''اور احسان کیا کر (غریبوں پر) جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ﴿وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۹۵﴾ (2/البقرۃ:195) ''اور سلوک و احسان کرو، بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

ترکیب 'وٗ' حرف عطف ہے اور اِذْ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے اُذْکُرُوْا محذوف ہے۔ قُلْنَا ماضی میں جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اُدْخُلُوْا فعل امر کا جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ یہ فعل لازم ہے اس لیے اس کا مفعول نہیں آئے گا۔ چنانچہ آگے مرکب اشاری هٰذِهِ الْقَرْيَةَ ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب

ہے۔ فَکُلُوْا میں 'ف' عطف کا ہے اور کُلُوْا، اُدْخُلُوْا پر عطف ہے۔ مِنْهَا، جار مجرور متعلق فعل ہیں۔ 'ھا' ضمیر اَلْقَرْیَةَ کے لیے ہے۔ حَیْثُ ظرف مکان ہے۔ شِئْتُمْ، ماضی میں جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ رَغَدًا، یہاں محذوف مفعول مطلق اَکْلًا کی صفت ہے یعنی یہ جملہ یوں ہے فَکُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ اَکْلًا رَغَدًا۔ رَغَدًا کو کُلُوْا کی ضمیر فاعلی کا حال بھی مانا گیا ہے۔ آگے 'وَ' عطف کا ہے اور اُدْخُلُوْا فعل امر کا صیغہ ہے۔ اَلْبَابَ، ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور سُجَّدًا، اُدْخُلُوْا کی ضمیر فاعلی کا حال ہے۔ وَقُوْلُوْا میں 'وَ' عطف کا ہے اور قُوْلُوْا فعل امر کا صیغہ ہے۔ حِطَّةٌ، اگر قُوْلُوْا کا مفعول ہوتا تو حالت نصب میں حِطَّةً آتا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ یہ مفعول نہیں ہے۔ یہاں حِطَّةٌ محذوف مبتدا کی خبر ہے اس لیے حالت رفع میں ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے وَقُوْلُوْا دُعَاءُنَا حِطَّةٌ۔ اَیْ: حُطَّ عَنَّا ذُنُوْبَنَا۔ آگے نَغْفِرْ، فعل امر قُوْلُوْا کا جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہوا ہے۔ لَکُمْ متعلق فعل ہے اور خَطٰیٰکُمْ مفعول ہے۔ وَ سَنَزِیْدُ میں 'وَ' استئنافیہ ہے 'س' مستقبل کے لیے ہے، نَزِیْدُ جمع متکلم کا صیغہ ہے اور اَلْمُحْسِنِیْنَ اس کا مفعول ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:58

وَاِذْ قُلْنَا	ادْخُلُوْا	هٰذِهِ الْقَرْیَةَ	فَکُلُوْا	مِنْهَا
اور (یاد کرو) جب ہم نے کہا	تم داخل ہو	اس بستی میں	اور تم کھاؤ	اس میں سے

حَیْثُ	شِئْتُمْ	رَغَدًا	وَّادْخُلُوا	الْبَابَ
جہاں سے	تم چاہو	جی بھر کے	اور تم داخل ہو	دروازے میں

سُجَّدًا	وَّقُوْلُوْا	حِطَّةٌ	نَّغْفِرْ	لَکُمْ
سجدہ کرنے والوں کی حالت میں	اور کہو	معافی ہو	تو ہم بخش دیں گے	تمہارے لیے

خَطٰیٰکُمْ ؕ	وَسَنَزِیْدُ	الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۸﴾
تمہاری خطاؤں کو	اور ہم زیادہ دیں گے	نیکی کرنے والوں کو

آیت:59

﴿ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ﴾

ب د ل

(ن) بَدْلًا بدلنا۔ بدلے میں لینا۔

بَدَلٌ اسم ذات ہے۔ بدلے میں ملی ہوئی چیز۔ بدل۔ بدلہ۔ ﴿ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾ ﴾ (18/الکہف:50) ''بہت برا ہے ظالموں کے لیے بدلہ۔''

(افعال) اِبْدَالًا کسی چیز کی جگہ دوسری چیز رکھنا۔ بدل دینا۔ بدلے میں دینا۔ ﴿ عَسٰی رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَآ ﴾ (68/القلم:32) ''امید ہے ہمارے رب سے کہ وہ بدلے میں دے ہم کو اس سے بہتر۔''

(تفعیل) تَبْدِیْلًا کسی چیز کی جگہ دوسری چیز رکھنا۔ بدل دینا یا بدلے میں دینا (تدریجاً)۔ تبدیل کرنا۔ ﴿ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَکَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ ﴾ (7/الاعراف:95) ''پھر ہم نے رفتہ رفتہ تبدیل کیا برائی کی جگہ کو بھلائی سے۔''

مُبَدِّلٌ اسم الفاعل ہے۔تبدیل کرنے والا۔﴿وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ﴾(6/الانعام:34)''اور کوئی تبدیل کرنے والا نہیں ہے اللہ کے فرمانوں کو۔''

بَدِّلْ فعل امر ہے۔تو بدل۔تو تبدیل کر۔﴿قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ﴾ (10/یونس:15)''کہتے ہیں وہ لوگ جن کو امید نہیں ہم سے ملاقات کی لے آ کوئی قرآن اس کے سوا یا اس کو بدل ڈال۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

(تفعّل) تَبَدُّلًا کسی چیز کی جگہ دوسری چیز رکھنا۔کسی چیز کی جگہ دوسری چیز لینا۔بدلنا۔﴿وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝﴾(2/البقرہ:108)''اور جو بدل لیتا ہے کفر کو ایمان سے تو وہ بھٹک گیا سیدھی راہ سے۔''

(استفعال) اِسْتِبْدَالًا کسی چیز کی جگہ دوسری چیز طلب کرنا۔تبدیلی چاہنا۔﴿اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ؕ﴾ (2/البقرہ:61)''کیا تم لوگ وہ چاہتے ہو جو گھٹیا ہے اس کے بدلے میں جو بہتر ہے۔''

ظ ل م: البقرۃ آیت17 دیکھیں۔ ق و ل: البقرۃ آیت8 دیکھیں۔ غَيْرُ: الفاتحہ آیت7 دیکھیں۔
ن ز ل: البقرۃ آیت4 دیکھیں۔

ر ج ز

(ن) رَجْزًا (۱) کسی چیز کا خوب ہلنا۔کپکپانا۔جب کمزوری کی وجہ سے چلتے وقت اونٹ کی ٹانگیں کپکپانے لگیں اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے لگے تو عرب کہتے ہیں رَجَزَ الْبَعِيْرُ۔(۲) رجزیہ اشعار (یعنی جنگی اشعار) پڑھنا۔

رِجْزٌ اور رُجْزٌ اسم ذات ہے۔(۱) عذاب، جو جسم پر کپکپی طاری کر دے۔مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''رِجْزٌ عام ہے۔ہر عذاب کے لیے خواہ وہ کسی صورت میں ہو'' اور بعض بزرگوں کے مطابق ایسا عذاب جو اپنی شدت کے باعث لرزہ خیز ہو اور اس کے جھٹکے شدید اور لگاتار ہوں۔(۲) گندگی۔نجاست۔بت۔﴿اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾(29/العنکبوت:34)''بے شک ہم نازل کرنے والے ہیں اس بستی کے لوگوں پر ایک عذاب آسمان سے۔''﴿وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ﴾ (8/الانفال:11)''اور تاکہ وہ لے جائے تم سے شیطان کی گندگی کو۔''﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝﴾(74/المدثر:5)''اور گندگی سے دور رہ۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔''اور بتوں سے الگ رہئے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔

س م و: آیت بسم اللہ دیکھیں۔ ف س ق: البقرۃ آیت26 دیکھیں۔

ترکیب 'ف' استئنافیہ ہے۔بَدَّلَ فعل۔اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اسم موصول اور صلہ مل کر اس کا فاعل اور قَوْلًا مفعول بِہٖ ہے۔جملہ غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ، قَوْلًا کی صفت ہے۔اسی لیے غَيْرَ حالت نصب میں ہے اور مضاف ہے۔اَلَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ، اسم موصول اور صلہ مل کر مضاف الیہ ہیں۔قِيْلَ، ماضی مجہول کا صیغہ ہے اور اس کا نائب الفاعل اس میں شامل ضمیر 'هُوَ' ہے اور اس سے مراد وہ بات ہے جس کے کرنے کا ان کو حکم دیا گیا تھا یعنی وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ۔لَهُمْ متعلق فعل ہے۔فَاَنْزَلْنَا میں 'ف' عطف کا ہے۔اَنْزَلْنَا فعل، رِجْزًا مفعول اور عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا متعلق فعل ہے۔مِنَ السَّمَآءِ، رِجْزًا کی صفت ہے۔رِجْزًا کی تنوین عذاب کی شدت کے اظہار کے لیے ہے۔بِمَا میں 'ب' سببیہ ہے اور 'مَا' یہاں مصدریہ ہے جس نے بعد والے جملے میں مصدری معنی پیدا کر دیے ہیں۔كَانُوْا، فعل ناقص ہے اور اس کا اسم اِس میں شامل ضمیر 'هُمْ' ہے اور آگے جملہ فعلیہ يَفْسُقُوْنَ اس کی خبر ہے۔یہ بھی یاد کر لیجئے

کہ کَانَ جب مضارع پہ داخل ہوتو اس سے دوام اور استمرار کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ 'ما' مصدریہ سے اب اس سارے جملے کی ترکیب ہوجائے گی بِسَبَبِ فِسْقِهِمُ الْمُسْتَمِرِّ۔ یعنی ان کی مسلسل نافرمانی کرنے کی وجہ سے ان پر آسمان سے عذاب نازل کیا گیا۔ اور یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ آیت میں اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا کی تکرار، ان ظالموں کے ظلم کو نمایاں کرنے کے لیے ہے۔ (واللّٰہ اعلم)۔

ترجمہ
البقرۃ:59

فَبَدَّلَ	الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا	قَوْلًا	غَیْرَ الَّذِیْ
تو بدل ڈالا	ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا	بات کو	اس کے علاوہ جو

قِیْلَ لَهُمْ	فَاَنْزَلْنَا	عَلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا	رِجْزًا
کہی گئی تھی ان سے	تو ہم نے نازل کیا	ان پر جنہوں نے ظلم کیا	ایک عذاب

مِّنَ السَّمَآءِ	بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾
آسمان سے	اُن کی مسلسل نافرمانی کرنے کی وجہ سے

نوٹ:1 ''تبدیلی یہ کی کہ بجائے حطۃ براہ تمسخر حنطۃ کہنے لگے (یعنی گیہوں) اور سجدہ کی جگہ اپنے سرینوں پر پھسلنا شروع کیا جب شہر میں پہنچے تو اُن پر طاعون پڑا، دوپہر میں ستر ہزار یہود مر گئے۔'' (تفسیر عثمانیؒ، ص ۱۲)

نوٹ:2 اس آیت مبارکہ کے تحت اگر معارف القرآن سے ''کلام میں لفظی تغیر وتبدّل کا حکم شرعی'' پڑھ لیا جائے تو انشاء اللہ بہت فائدہ ہوگا۔

آیت:60

﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۶۰﴾﴾

اِذْ: البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔

س ق ی

(ض) سَقْیًا اور سِقَایَةً کسی کو پلانا۔ سیراب کرنا۔ ﴿وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾﴾ (76/الدھر:21) ''اور پلائے گا ان کو ان کا رب انتہائی پاکیزہ شراب۔'' ﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (9/البقرۃ:19) ''کیا تم نے کر دیا حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد الحرام کا بسانا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

سُقْیًا مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً (۱) مصدر ہے بمعنی کسی کو پلانا۔ (۲) مصدر ہے بمعنی پانی پینا۔ (۳) اسم ذات ہے بمعنی پانی پینے کی باری۔ ﴿فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْیٰهَا ﴿۱۳﴾﴾ (91/الشمس:13) ''اور ان لوگوں سے اللہ کے رسول نے کہا کہ اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے سے خبردار رہنا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ''پھر کہا اُن کو اللہ کے رسول نے خبردار رہو اللہ کی اونٹنی سے اور اس کی پانی پینے کی باری سے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

سِقَایَۃٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے اور مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔(۱) پانی پلانے کی جگہ۔(۲) پانی پینے کا برتن۔ پیالہ۔(۳) پانی جمع کرنے کی جگہ۔حوض۔﴿ جَعَلَ السِّقَایَۃَ فِیۡ رَحۡلِ اَخِیۡہِ ﴾(12/یوسف:70)''اس نے رکھا پانی کے پیالے کو اپنے بھائی کے تھیلے میں۔''

(افعال) اِسۡقَاءً کسی کو پینے کے لیے دینا۔﴿ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا ﴾(16/النحل:66)''ہم پینے کے لیے دیتے ہیں تم کو اس میں سے جو ان کے پیٹوں میں ہے، گوبر اور خون کے بیچ میں سے خالص دودھ۔''

(استفعال) اِسۡتِسۡقَاءً کسی سے پانی طلب کرنا۔ پینے کے لیے مانگنا۔﴿ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اِذِ اسۡتَسۡقٰىہُ قَوۡمُہٗۤ ﴾(7/الاعراف:160) ''اور ہم نے وحی کی حضرت موسیٰؑ کی طرف جب پینے کے لیے مانگا اس سے اس کی قوم نے۔'' اور آیت زیر مطالعہ۔

ق و م: الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔ ق و ل: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ ض ر ب: البقرۃ آیت 26 دیکھیں۔

ع ص و

(ن) عَصۡوًا کسی کو لاٹھی سے مارنا۔

عَصَا تثنیہ: عَصَوَانِ۔ ج: عِصِیٌّ۔ اسم ذات ہے۔لاٹھی۔﴿ قَالَ ہِیَ عَصَایَ ﴾(20/طٰہٰ:18)''انہوں نے کہا یہ میری لاٹھی ہے۔'' ﴿ فَاَلۡقَوۡا حِبَالَہُمۡ وَ عِصِیَّہُمۡ ﴾ (26/الشعراء:44)''تو ان لوگوں نے ڈالیں اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں۔''

ح ج ر: البقرۃ آیت 24 دیکھیں۔

ف ج ر

(ن) (ا) فَجۡرًا کسی چیز کو وسیع طور پر پھاڑنا۔کسی چیز کو پھاڑ کر پانی بہانا۔ پانی کے بہاؤ کے لیے راستہ چیرنا۔﴿ وَ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الۡاَرۡضِ یَنۡۢبُوۡعًا ﴾(17/بنی اسرائیل:90)''اور انہوں نے کہا ہم ہرگز نہ مانیں گے تیری بات یہاں تک کہ تو پھاڑ کر بہادے ہمارے لیے زمین سے ایک چشمہ۔''

فَجۡرٌ اصل میں مصدر ہے لیکن بطور ظرف بھی استعمال ہوتا ہے۔فجر کا وقت۔صبح۔فجر کو فجر اس لیے کہتے ہیں کہ صبح کی روشنی بھی رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ ﴾(17/بنی اسرائیل:78)''آپؐ نماز قائم کیجئے سورج ڈھلنے (کے بعد) سے لے کر رات کا اندھیرا ہونے تک اور (قائم کیجئے) فجر کے وقت کا قرآن پڑھنا بھی (یعنی فجر کی نماز)۔''

(ب) فُجُوۡرًا اس کا لغوی معنی ہے سوار کا زین سے ایک طرف جھک جانا۔ پھر یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑ کر اپنی مرضی کرنا، حق سے روگردانی کرنا، نافرمانی کرنا اور جھوٹ بولنا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔﴿ یُرِیۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِیَفۡجُرَ اَمَامَہٗ ۚ ﴾ (75/القیامہ:5)''بلکہ انسان چاہتا ہے کہ وہ نافرمانی کرے اپنے آگے بھی یعنی آئندہ بھی۔''

فُجُوْرٌ اسم ذات بھی ہے۔ نافرمانی۔ برائی۔ ﴿وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ۝﴾ (91/الشّمس:7-8) ''قسم ہے نفس کی اور اس کو درست کرنے والے کی۔ پھر اس کے دل میں ڈال دیا اس کی نافرمانی اور اس کی پارسائی کو۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

فَاجِرٌ ج: فَاجِرُوْنَ، فُجَّارٌ اور فَجَرَةٌ۔ فُجُوْرٌ سے اسم الفاعل ہے۔ نافرمانی کرنے والا، دین کا پردہ پھاڑنے والا، علانیہ گناہ کرنے والا، جھوٹا۔ ﴿وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝﴾ (71/نوح:27) ''اور وہ لوگ (اولاد) نہیں جنیں گے مگر نافرمان ناشکری۔'' ﴿اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝﴾ (38/صٓ:28) ''یا ہم بنا دیں گے پرہیزگاروں کو نافرمانوں جیسا۔'' ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝﴾ (80/عبس:42) ''وہ یہی کافر بدکردار لوگ ہوں گے۔''

(تفعیل) **تَفْجِيْرًا** پھاڑنا۔ پھاڑ کر بہانا (اس میں تسلسل کا مفہوم ہوتا ہے)۔ ﴿وَ فَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۝﴾ (36/یٰسٓ:34) ''اور ہم نے جاری کیے اس میں چشمے۔''

(تفعّل) **تَفَجُّرًا** پھوٹ بہنا۔ (کوشش اور تکلّف سے)۔ ﴿وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ﴾ (2/البقرہ:74) ''اور بے شک پتھروں میں وہ بھی ہیں جن سے پھوٹ بہتی ہیں نہریں۔''

(انفعال) **اِنْفِجَارًا** پھوٹ بہنا۔ (بلا تکلّف)۔ آیت زیرِ مطالعہ۔

ع	ی	ن

(ض) **عَيْنًا** (۱) نظر لگانا۔ (۲) پانی یا آنسو جاری ہونا۔ (۳) آنکھ پر مارنا۔

عَيْنٌ ج: اَعْيُنٌ۔ اسم ذات ہے۔ آنکھ۔ ﴿وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ﴾ (5/المآئدہ:45) ''اور ہم نے واجب کیا ان پر اس میں (یعنی تورات میں) کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ۔'' ﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ (11/ھود:37) ''اور آپؑ بنائیں کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے۔'' عربی زبان میں عَيْنٌ کے معنی کسی چیز کا محافظ کے بھی آتے ہیں اور جب کہا جائے فُلَانٌ بِعَيْنِیْ تو اس سے مراد ہوتی ہے کہ فلاں میری حفاظت اور نگرانی میں ہے۔ چنانچہ ھود:37 کا ترجمہ اس محاورے کے لحاظ سے بھی کیا گیا ہے: ''اور تم کشتی ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے تیار کرو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت کے حاشیے میں علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''حق تعالیٰ نے نوحؑ سے فرمایا کہ ایک کشتی ہمارے رُوبرُو (یعنی ہماری حفاظت ونگرانی میں) ہمارے حکم اور تعلیم والہام کے موافق تیار کرو۔'' (تفسیر عثمانی، ص۲۹۸)

عَيْنٌ ج: عُيُوْنٌ۔ اسم ذات ہے۔ پانی کا چشمہ۔ ﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ﴾ (76/الدھر:6) ''ایک چشمہ، پئیں گے اس سے اللہ کے بندے۔'' ﴿فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۝﴾ (26/الشعراء:57) ''تو ہم نے نکالا ان کو باغوں اور چشموں سے۔''

عَيْنَاءُ ج: عِيْنٌ۔ یہ اَفْعَلُ الْعیوب میں اَعْيَنُ کی مؤنث ہے۔ مراد ہے بڑی اور خوب صورت آنکھوں والی۔ محاورہ عرب میں عِيْنٌ اور حُوْرٌ آنکھوں کی صفات ہیں اور اس سے عورت کا حسن و جمال مراد لیا جاتا ہے۔ عِيْن سے مراد موٹی موٹی آنکھوں والی اور حُوْر سے مراد ایسی عورت جس کی آنکھوں کی سفیدی نہایت سفید ہو اور سیاہی خوب سیاہ ہو۔ قرآن مجید میں فرمایا: ﴿وَ عِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ۝﴾ (37/الصافات:48) ''اور ان کے پاس ہیں نگاہ نیچی رکھنے

والیاں، بڑی آنکھوں والیاں۔'' وحشی/نیل گائے کی آنکھیں بھی چونکہ موٹی اور خوب صورت ہوتی ہیں لہٰذا اسے بھی عَیْنَاء کہا جاتا ہے۔

مَعِیْنٌ لغت میں اس لفظ کے دو مادے آتے ہیں (۱) م ع ن (ف) مَعْنًا، جس کا مطلب ہے پانی جاری ہونا، پانی جاری کرنا اور (۲) ع ی ن (ض) عَیْنًا، جس کا بھی ایک مطلب ہے پانی جاری ہونا۔ چنانچہ اس کا مادہ اگر م ع ن ہو تو یہ فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے بمعنی ''ہمیشہ اور ہر حال میں جاری شفاف پانی جو کبھی خشک نہ ہو'' اور اگر اس کا مادہ ع ی ن ہو تو پھر یہ مَفْعِلٌ کے وزن پر ظرف مکان ہے بمعنی ''پانی جاری ہونے کی جگہ''۔ مَفْعِلٌ کے وزن پر اصل میں مَعْیِنٌ بنے گا، جو پھر قواعد کے اطلاق کے بعد مَعِیْنٌ بن جائے گا۔ حضرت مولانا محمد نسیم صاحب بارہ بنکویؒ نے ''منتخب لغات القرآن'' میں سورہ مؤمنون کی آیت 50 کے تحت یہ دونوں باتیں لکھ دی ہیں، البتہ زیادہ تر علماء کی رائے کے مطابق اس لفظ کا مادہ ''م ع ن'' ہے (واللہ اعلم)۔ ہم اس لفظ کو ''ع ی ن'' کے تحت بھی پڑھ رہے ہیں اور انشاء اللہ سورہ مؤمنون کی آیت 50 کے تحت 'م ع ن'' میں بھی پڑھیں گے۔ ﴿وَاٰوَیْنٰهُمَآ اِلٰی رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ ۝﴾ (23/المؤمنون:50) ''اور ہم نے ان دونوں کو بلند زمین پر پناہ دی جو ٹھہرنے کے قابل تھی اور جہاں چشمے جاری تھے۔''

قَدْ قَدْ حرفِ تحقیق ہے اور فعل کے ساتھ مخصوص ہے۔ فعل ماضی پر بھی داخل ہوتا ہے اور مضارع پر بھی۔ ماضی پر داخل ہو تو (۱) ماضی مطلق کو ماضی قریب بنا دیتا ہے اور (۲) تاکید اور فی الواقع ہونے کا مفہوم پیدا کرتا ہے اور شک کو دور کرتا ہے۔ مثلاً: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (23/المومنون:1) ''یقیناً ایمان والوں نے فلاح پالی۔'' ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا﴾ (58/المجادلۃ:1) ''بے شک اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپؐ سے اپنے شوہر کے بارے میں تکرار کر رہی تھی۔'' کبھی تاکید بڑھانے کے لیے قَدْ پر لام تاکید بھی داخل کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً: ﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (48/الفتح:18) ''یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہو گیا۔'' فعل مضارع پر قَدْ داخل ہو تو تکثیر کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ﴾ (2/البقرۃ:144) ''ہم نے کئی بار دیکھا ہے آپؐ کے چہرے کا آسمان کی طرف اٹھنا۔'' اس آیت میں بقول زمخشری کثرت رؤیت مراد ہے۔ قَدْ کے اور بھی کئی استعمالات ہیں جو لغات القرآن سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

ع ل م: الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔ ك ل ل: البقرۃ آیت 20 دیکھیں۔

ء ن س

(ض) **اِنْسًا، اُنْسًا** کسی چیز کو دیکھ کر یا سن کر وحشت دور ہونا۔ اجنبیت دور ہونا۔ مانوس ہونا۔

اَلْاِنْسَانُ البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

(افعال) **اِیْنَاسًا** کسی چیز سے انس پانا۔ کسی چیز کو دیکھنا اور جاننا۔ محسوس کرنا۔ صاحبؒ مترادفات القرآن لکھتے ہیں: ''انس کے معنی نہ غور کرنا ہے نہ نظر سے دیکھنا اور نہ دیدۂ دل سے دیکھنا (یعنی دل کی نظر سے دیکھنا) بلکہ اس کا معنی مانوس ہونا یا کسی چیز کا قرائن سے معلوم ہونا اور امام راغبؒ کے الفاظ میں کسی سے انس پانا ہے۔ تاہم اپنی زبان کے محاورہ کے لحاظ سے اس کا ترجمہ دیکھنا سے کر لیا جاتا ہے یعنی دُور سے یا گہری نظر سے دیکھ کر معلوم کر لینا۔'' (مترادفات القرآن:۵۰۶)۔ ﴿فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا﴾ (4/النساء:6) ''پھر اگر تم دیکھو ان میں سمجھ بوجھ۔'' ﴿اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا﴾ (27/النمل:7) ''میں نے آگ دیکھی۔''

(استفعال) اِسْتِیْنَاسًا انسیت چاہنا۔کسی کو اپنے سے مانوس کرنا تا کہ وحشت دور ہو۔اجازت لینا۔اس کے ساتھ 'لٰ' کا صلہ آئے تو مطلب ہوتا ہے کسی کام کے لیے جی لگا کر بیٹھنا۔﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ﴾(24/النور:27)''اے ایمان والو تم اپنے (خاص) گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو جب تک کہ اجازت حاصل نہ کرلو اور ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو۔''اس آیت کے تحت مولانا عبدالماجدؒ فرماتے ہیں:''تَسْتَاْنِسُوْا: محض اجازت طلب کرنے کے لیے لفظ تَسْتَاْذِنُوْا کافی تھا۔بجائے اس کے تَسْتَاْنِسُوْا لانے سے (جو انس سے ہے) مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسے اپنا نام و پتہ پوری طرح بتا دو تا کہ اسے وحشت نہ رہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ،ص:۷۳۶)

مُسْتَاْنِسٌ ج: مُسْتَاْنِسُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔انسیت چاہنے والا۔جی لگا کر بیٹھ رہنے والا۔﴿ فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ ﴾(33/الاحزاب:53)''پھر جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھے رہا کرو۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

ش ر ب

(س) شَرْبًا، شِرْبًا، شُرْبًا پینا۔﴿ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ۚ ﴾(2/البقرہ:249)''پس جس نے پیا اس سے تو وہ نہیں ہے مجھ سے۔''

اِشْرَبْ ج: اِشْرَبُوْا۔فعل امر ہے۔تو پی۔﴿ وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ ﴾(7/الاعراف:31)''اور تم لوگ پیو اور ضرورت سے زیادہ خرچ مت کرو۔''

شَارِبٌ ج: شَارِبُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔پینے والا۔﴿ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ۚ ﴾(47/محمد:15)''اور کچھ نہریں ہیں لذیذ شراب کی پینے والوں کے لیے۔''

مَشْرَبٌ ج: مَشَارِبُ۔اسم الظرف ہے۔پینے کی جگہ۔مَشْرَبٌ آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے اور ﴿ وَ لَهُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ﴾(36/یٰسٓ:73)''اور ان کے لیے ہے اس میں نفع اٹھانے اور پینے کے مقامات۔''

شِرْبٌ پانی پینے کی ایک باری۔پانی کا ایک حصہ۔﴿ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۚ ﴾(26/الشعراء:155) ''یہ ایک اونٹنی ہے۔اس کے لیے ہے پینے کی ایک باری اور تمہارے لیے ہے ایک معلوم دن کی پینے کی باری۔''

شُرْبٌ یہ مصدر ہے بمعنی پینا اور اسم کا معنی بھی دیتا ہے بمعنی مشروب۔﴿ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِیْمِ ۚ ﴾(56/الواقعہ:55)''پھر وہ لوگ پینے والے ہیں پیاسے اونٹ کی طرح پینا۔''

شَرَابٌ اسم ذات ہے۔پینے کی چیز۔''شراب عربی میں ہر مشروب (پینے والی چیز) کو کہتے ہیں۔اس سے ذہن اُردو کے لفظ شراب اور اُس کے گندھے، نشیلے مفہوم کی طرف کہیں منتقل نہ ہو جائے۔''(تفسیر ماجدیؒ)۔''ہر وہ چیز جس کو چبانا نہ پڑے بلکہ پیا جائے، عربی میں اس کے لیے شراب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔''(لغات القرآن، ج۳،ص۲۶۵)۔﴿ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ ﴾(10/یونس:4)''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے ہے پینے کی چیز کھولتے پانی میں سے۔''اردو میں جسے شراب کہا جاتا ہے عربی میں اسے ''خمر'' کہتے ہیں۔

(افعال) اِشْرَابًا پلانا۔﴿وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ﴾(2/البقرہ:93)''اور پلایا گیا ان کے دلوں میں بچھڑے (کی محبت کو) ان کے کفر کی وجہ سے۔'' عربی محاورے میں جب کسی کی محبت یا دشمنی دل میں سرایت کر جائے تو اس کے لیے لفظ شَرَابٌ کو بطور استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ اُشْرِبَ فِیْ قَلْبِهٖ حُبَّ فُلَانٍ کا مطلب ہے، اس کے دل میں اس کی محبت جڑ پکڑ گئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''﴿اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمْ﴾ مراد یہ ہے کہ گوسالا کی محبت ان کی رگ رگ میں رچ گئی تھی، جیسے پانی رگ رگ میں پہنچ کر جزوبدن بن جاتا ہے۔ مشروب سے یہ استعارہ شدید محبت اور شدید نفرت دونوں موقعوں پر اہل عرب کی زبان میں عام ہے۔''(تفسیر ماجدیؒ:۴۷)

ع ك ل: البقرۃ آیت 35 دیکھیں۔ ر ز ق: البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔ ء ل ہ: آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ع ث ی

(ف۔س) عِثِيًّا کفر یا غرور میں مبالغہ کرنا۔ سخت فساد پیدا کرنا۔ انتشار پھیلانا۔

لَا تَعْثَوْا فعل نہی ہے۔ جمع مذکر حاضر کا صیغہ۔ تم فسادمت پھیلاؤ۔ آیت زیر مطالعہ۔ نوٹ: لَا تَعْثَوْا کا مادہ بعض اہل لغت نے 'ع ی ث' بھی لکھا ہے، عَيْثًا مصدر سے۔ عَيْثٌ کا لفظ زیادہ تر فسادِ حسی کے لیے بولا جاتا ہے اور عِثِيٌّ کا لفظ ذہنی اور فکری فساد کے لیے یعنی تقریروں اور لٹریچر کے ذریعے غلط عقائد اور نظریات پھیلانا۔

ء ر ض: البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔ ف س د: البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

ترکیب

'وَ' حرف عطف ہے۔ اِذْ ظرف زمان ہے۔ اس سے پہلے اُذْكُرُوْا محذوف ہے۔ اِذْ کو آگے ملانے کے لیے زیر دی ہے۔ اِسْتَسْقٰی کے فاعل حضرت موسیٰؑ ہیں اور لِقَوْمِهٖ متعلق فعل ہے۔ فَقُلْنَا میں 'ف' عطف کا ہے اور قُلْنَا ماضی میں جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحْنُ ہے۔ اِضْرِبْ فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتَ کی ضمیر ہے جو حضرت موسیٰؑ کے لیے ہے، بِعَصَاكَ متعلق فعل ہے اور اَلْحَجَرَ مفعول ہے اس لیے نصب میں ہے۔ اِنْفَجَرَتْ کا فاعل اِثْنَتَا عَشْرَةَ ہے۔ چونکہ گیارہ سے انیس تک کے عدد میں عَشَرَ مبنی برفتحہ ہوتا ہے اس لیے اِثْنَتَا (دراصل اِثْنَتَانِ) فاعل ہونے کی وجہ سے رفع میں ہے، مِنْهُ، جار مجرور متعلق فعل ہیں اور 'ہ' ضمیر اَلْحَجَرَ (پتھر) کے لیے ہے، جبکہ عَيْنًا تمیز ہونے کی وجہ سے نصب میں ہے۔ قَدْ تاکید کے لیے ہے اور عَلِمَ کا فاعل كُلُّ اُنَاسٍ ہے۔ یہ چونکہ مرکب اضافی ہے اس لیے فاعل کی رفع صرف مضاف كُلُّ پر آئی ہے۔ مَشْرَبَهُمْ بھی مرکب اضافی اور عَلِمَ کا مفعول ہے، اسی لیے منصوب ہے۔ اس کی نصب بھی صرف مضاف مَشْرَبَ پر آئی ہے۔ كُلُوْا اور اِشْرَبُوْا دونوں امر کے صیغے ہیں ان کے درمیان 'وَ' عطف کا ہے اور ان سے پہلے قُلْنَا لَهُمْ محذوف ہے۔ مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ متعلق فعل ہے۔ وَلَا تَعْثَوْا میں 'وَ' عطف کا ہے 'لَا' نہی کا ہے اور تَعْثَوْا، مضارع مجزوم ہے۔ اس کا فاعل اِس میں شامل ضمیر اَنْتُمْ ہے۔ فِی الْاَرْضِ متعلق فعل ہے اور مُفْسِدِيْنَ دراصل لَا تَعْثَوْا میں شامل اَنْتُمْ ضمیر فاعلی کا حال ہے اس لیے منصوب ہے۔ اس آخری حصے کے متعلق مولانا عبدالماجدؒ فرماتے ہیں: ''عثی کے معنی خود ہی فساد میں حد سے گزر جانے کے ہیں۔ مُفْسِدِيْنَ جو ترکیب میں حال واقع ہوا ہے۔ ہر پہلو سے فساد کی تاکید کے لیے ہے۔''

ترجمہ	وَاِذِ اسْتَسْقٰی	مُوْسٰی	لِقَوْمِهٖ	فَقُلْنَا	اضْرِبْ	بِّعَصَاكَ
البقرۃ:60	اور (یاد کرو) جب پینے کے لیے پانی مانگا	حضرت موسیٰؑ نے	اپنی قوم کے لیے	تو ہم نے کہا	آپؑ ماریئے	اپنی لاٹھی سے

الْحَجَرَ ؕ	فَانْفَجَرَتْ	مِنْهُ	اثْنَتَا عَشْرَةَ	عَيْنًا ؕ	قَدْ عَلِمَ	كُلُّ اُنَاسٍ
پتھر کو	پس پھوٹ نکلے	اس سے	بارہ	چشمے	جان لیا	ہر ایک گروہ نے

مَّشْرَبَهُمْ ؕ	كُلُوْا وَاشْرَبُوْا	مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ	وَلَا تَعْثَوْا
اپنے پینے کی جگہ کو	(اور ہم نے اُن سے کہا) تم لوگ کھاؤ اور پیو	اللہ کے رزق میں سے	اور تم لوگ انتشار مت پھیلاؤ

فِي الْاَرْضِ	مُفْسِدِيْنَ
زمین میں	فساد برپا کرنے والے ہوتے ہوئے

نوٹ صاحبؒ مترادفات القرآن لکھتے ہیں: ''اَفْسَدَ کا اطلاق صرف ایک بار فساد کرنے پر بھی ہوسکتا ہے اور جب فساد عادت کی شکل اختیار کر جائے تو عَاثَ یا عَثَا آئے گا۔'' (مترادفات القرآن، ص ۶۶۷)۔ اور حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں: ''لَا تَعْثَوْا، عثیٌ سے مشتق ہے جس کے معنی سخت فساد مچانے کے ہیں۔ یعنی مفسد اور فسادی تو تم پہلے ہی سے ہو مگر خیر اس فساد کو تم اپنی ہی ذات تک محدود رکھو۔ اس میں اور کسی قسم کا اضافہ نہ کرو اور نہ لوگوں میں اس کو پھیلاؤ۔'' (معارف القرآن، ج ۱، ص: ۱۸۹)۔ گویا فسادی کا فساد جب اس کی ذات سے عام معاشرے میں پھیلنے لگے اور دوسرے لوگ بھی اس کی زد میں آنے لگیں تو یہ شدتِ فساد یعنی عثیٌ ہے۔ (واللہ اعلم)۔

آیت: 61

﴿ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾ ع ﴾

اِذْ: البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔ ق و ل: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ ص ب ر: البقرۃ آیت 45 دیکھیں۔

ط ع م

(س) طَعْمًا، طَعَامًا اِس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کو چکھنا۔ چکھنا، کھانے سے بھی ہوسکتا ہے اور پینے سے بھی۔ اس لیے یہ لفظ کسی چیز کو کھانے اور پینے، دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کھانے کے لیے فرمایا: ﴿ فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا ﴾ (33/الاحزاب:53) ''پس جب تم لوگ کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ۔'' عام مفہوم یہی لیا جاتا ہے۔ اور پینے کے لیے فرمایا: ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ ﴾ (2/البقرۃ:249) ''اور جس نے نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت میں يَطْعَمْهُ کا ترجمہ چکھنے سے بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً: ''اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بے شک میرا ہے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

طَعْمٌ اسم ذات بھی ہے۔ذائقہ۔مزہ۔﴿وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ﴾(47/محمد:15)''اور نہریں ہیں دودھ کی،نہیں بدلتا ان کا ذائقہ۔''

طَعَامٌ اسم ذات بھی ہے۔اس کے عام معنی ہیں خوراک۔کھانے کی چیز۔کھانا۔جیسے فرمایا:﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾(3/آل عمران:93)''سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اسرائیل کے لیے۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔''ہر کھانا بنی اسرائیل کے لیے حلال تھا۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔حدیث مبارک میں طعام کا لفظ گندم کے لیے بھی آیا ہے۔چنانچہ حضرت ابوسعید الخدریؓ کی روایت میں صَاعًا مِنْ طَعَامٍ کے الفاظ آئے ہیں۔البتہ بعض علماءِ کرام نے اس حدیث میں طعام کے عام معنی ہی لیے ہیں۔سورۃ المائدہ کی آیت 5 میں طعام کا لفظ''ذبیحہ'' کے لیے استعمال ہوا ہے۔چنانچہ فرمایا:﴿وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ﴾(5/المائدۃ:5)''اور اہل کتاب کا ذبیحہ تمہارے لیے حلال ہے۔''اور کبھی طعام کا لفظ اِطْعَامٌ،''کسی کو کھانا کھلانا'' کے معنوں میں بھی استعمال ہو جاتا ہے جیسے فرمایا:﴿وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾(107/الماعون:3)''اور فقیر کے کھانا کھلانے پر رغبت نہیں دلاتا۔''

طَاعِمٌ اسم الفاعل ہے۔کھانے والا۔﴿لَآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ﴾(6/الانعام:145)''میں نہیں پاتا اس میں جو وحی کیا گیا میری طرف کسی حرام کی ہوئی چیز کو کھانے والے پر،وہ کھاتا ہے جس کو۔''

(افعال) اِطْعَامًا کسی کو کھانا کھلانا۔کسی کو کھانا دینا۔﴿الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ﴾(106/قریش:4)''جس نے کھلایا ان کو بھوک میں۔''

اَطْعِمْ ج:اَطْعِمُوْا۔فعل امر ہے۔تو کھلا۔﴿وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾(22/الحج:36)''اور تم لوگ کھلاؤ قناعت کرنے والے کو(یعنی سوال نہ کرنے والے کو)اور مانگنے والے کو۔''

(استفعال) اِسْتِطْعَامًا کھانا مانگنا۔﴿اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ اِسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا﴾(18/الکہف:77)''جب وہ دونوں پہنچے بستی والوں کے پاس تو انہوں نے کھانا مانگا اس کے رہنے والوں سے۔''

و ح د

(ض) وَحْدًا، وَحْدَةً تنہا ہونا۔اکیلا ہونا۔﴿قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ﴾(7/الاعراف:70)''انہوں نے کہا کیا آپؑ ہمارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں۔''قاموس القرآن کے مطابق وَحْدٌ کا لفظ ضمیر واحد کی طرف مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے جیسے خَلَقَ اللّٰهُ الْعَالَمَ وَحْدَهٗ،تنہا اللہ نے دنیا پیدا کی۔

وَاحِدٌ فَاعِلٌ کے وزن پر صفت ہے۔تنہا۔اکیلا۔ایک۔﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾(2/البقرۃ:163)''اور تمہارا معبود ایک معبود ہے۔''کبھی اس کا استعمال اَحَدٌ کے معنی میں بھی ہوتا ہے یعنی لاثانی،بے نظیر۔عربی میں کہا جاتا ہے هُوَ وَاحِدُ قَوْمِهٖ۔وہ اپنی قوم میں لاثانی ہے یعنی علم وفضیلت وغیرہ میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔اسمائے حسنیٰ میں یہی معنی مراد ہے۔چنانچہ فرمایا:﴿هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾(39/الزمر:4)''وہی اللہ ہے اکیلا،سب پر غالب۔''گنتی کا سب سے پہلا عدد بھی ہے یعنی ایک اور کبھی وَاحِدٌ،عدد کی صفت کے طور پر آتا ہے مثلاً اَلْفٌ وَاحِدٌ(ایک ہزار)۔

وَاحِدَةٌ وَاحِدٌ کی مونث۔ایک۔اکیلی۔﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾(2/البقرۃ:213)''تھے سب لوگ ایک دین پر۔''عَشْرَةٌ وَّاحِدَةٌ(ایک عشرہ)،مِائَةٌ وَّاحِدَةٌ(ایک سو)۔

وَحِيۡدٌ فَعِيۡلٌ کے وزن پر صفت ہے۔تنہا۔اکیلا۔منفرد۔﴿ ذَرۡنِيۡ وَمَنۡ خَلَقۡتُ وَحِيۡدًا ﴾(74/المدثر:11)''آپ چھوڑ دیں مجھ کواور اس کو جسے میں نے پیدا کیا اکیلا۔''

دع و:البقرۃ آیت23دیکھیں۔ ر ب ب:الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔ خ ر ج:البقرۃ آیت22دیکھیں۔

ن ب ت

(ن) نَبۡتًا اور نَبَاتًا کسی چیز کا اگنا یا اگانا۔(لازم ومتعدی)۔﴿وَشَجَرَةً تَخۡرُجُ مِنۡ طُوۡرِ سَيۡنَآءَ تَنۡۢبُتُ بِالدُّهۡنِ ﴾(23/المؤمنون:20) ''اور ایک درخت، وہ نکلتا ہے طور سینا سے، اگتا ہے روغن کے ساتھ۔''اس آیت میں تَنۡۢبُتُ بِالدُّهۡنِ کی وضاحت کرتے ہوئے صاحبِ لغات القرآن فرماتے ہیں:''تَنۡۢبُتُ بِالدُّهۡنِ (وہ تیل اگاتی ہے) میں بَا حال کے لیے ہے تعدیہ کے لیے نہیں، کیونکہ نَبَتَ خود متعدی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ اس طرح اگتی ہے کہ تیل اس میں بالقوہ موجود ہوتا ہے۔''(لغات القرآن، ج ۲ص: ۱۹۳)۔

نَبَاتٌ اسم ذات بھی ہے۔زمین سے اگنے والی ہر چیز۔زمین کی پیداوار۔سبزہ۔﴿وَالۡبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخۡرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذۡنِ رَبِّهٖ ﴾(7/الاعراف:58)''اور پاک شہر، نکلتا ہے اس کا سبزہ اس کے رب کی اجازت سے۔'' امام راغبؒ فرماتے ہیں:''ہر وہ چیز جو زمین سے اگتی ہے۔اسے نَبۡتٌ یا نَبَاتٌ کہا جاتا ہے۔خواہ وہ تنہ دار ہو جیسے درخت۔یا بے تنہ۔جیسے جڑی بوٹیاں لیکن عرف میں خاص کر نبات اسے کہتے ہیں جس کا تنہ نہ ہو۔بلکہ عوام تو جانوروں کے چارہ پر ہی نبات کا لفظ بولتے ہیں۔چنانچہ آیت کریمہ:﴿ لِّنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا ﴾(78/النبا:15)''تا کہ اس سے اناج اور سبزہ پیدا کریں۔میں نبات سے مراد چارہ ہی ہے لیکن یہ اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے ہر بڑھنے والی چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔اور نباتات، حیوانات اور انسان سب پر بولا جاتا ہے اور اِنۡبَات!(افعال) کا لفظ ان سب چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔(مفردات القرآن، ج ۲ص: ۱۰۲۴)

(افعال) اِنۡبَاتًا اگانا۔بڑھانا۔نشو ونما کرنا۔﴿وَ اَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ﴾(27/النمل:60)''اور اس نے اتارا تمہارے لیے آسمان سے پانی پھر اس نے اگائے اس سے باغات۔''﴿وَّ اَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ﴾(3/آل عمران:37)''اور بڑھایا اُس کو اچھی طرح بڑھانا۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔﴿ وَاللّٰهُ اَنۡۢبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا ﴾(71/نوح:17)''اور تم کو زمین سے ایک(خاص اہتمام سے) اگایا ہے(اور پیدا کیا ہے)۔''(ترجمہ احسن البیان)۔

ع ر ض:البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

بَقۡلٌ: سبزی۔ترکاری۔ساگ۔تدبر قرآن کے مطابق بقل کا لفظ سبزیوں اور ترکاریوں کی تمام اقسام کے لیے عام ہے۔

قِثَّآءٌ: ایک قسم کی لمبی سبز سبزی۔تر۔ککڑی۔

فُوۡمٌ: گندم۔گیہوں۔لہسن۔

عَدَسٌ: مسور۔دال

بَصَلٌ: پیاز

نوٹ: اِن الفاظ کے مادوں کی وضاحت نہیں کی گئی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اِن مادوں سے کوئی اور لفظ قرآنِ مجید میں استعمال نہیں ہوا ہے اور یہ الفاظ بھی صرف

اسی آیت میں آئے ہیں۔اس لیے اِن الفاظ کا صرف ترجمہ دے دیا گیا ہے۔

ب د ل: البقرۃ آیت 59 دیکھیں۔

د ن و

(ن۔س) (ل) دُنُوًّا (۱) قریب ہونا۔نزدیک ہونا۔خواہ یہ قرب ذاتی ہو، حکمی ہو، مکانی یا زمانی ہو یا بلحاظ مرتبہ ہو یہ لفظ سب کے لیے بولا جاتا ہے۔﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى﴾(53/النجم:8)''پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ) (۲) اچھا ہونا۔بہتر ہونا۔

(ب) دَنَايَةً، دَنَاءَةً کم تر ہونا۔حقیر ہونا۔ذلیل ہونا۔

دَانٍ مؤنث دَانِيَةٌ۔ فَاعِلٌ کے وزن پر اسم الفاعل ہے۔قریب ہونے والا۔جھکنے والا۔قریب۔﴿وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ﴾(55/الرحمٰن:54)''اور دونوں باغوں کے پھل بہت ہی قریب ہوں گے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)''اور دونوں باغوں کا پھل نیچے جھکا ہوگا۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔﴿فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ﴾(69/الحاقۃ:22-23)''اونچے باغ میں جس کے میوے جھکے پڑے ہیں۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

اَدْنٰى افعل التفضیل ہے۔واحد مذکر۔مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) زیادہ قریب۔زیادہ نزدیک۔﴿ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا﴾(2/البقرۃ:282)''اس میں پورا انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور بہت درست رکھنے والا ہے گواہی کو اور نزدیک ہے کہ شبہ میں نہ پڑو۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔﴿ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا﴾(4/النساء:3)''اس میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔﴿ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ﴾(5/المائدۃ:108)''یہ طریقہ زیادہ قریب ہے کہ گواہ دیا کریں گواہی جیسا کہ چاہیے۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ﴾(73/المزمل:20)''بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو اٹھتا ہے نزدیک دو تہائی رات کے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ﴾(30/الروم:3)''اہل روم ایک قریب کی زمین میں مغلوب ہو گئے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

(۲) زیادہ بہتر۔زیادہ مناسب۔﴿ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ﴾(33/الاحزاب:59)''یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔''(ترجمہ تفہیم القرآن)۔

(۳) اگر''خیر''(بہتر) کے مقابلے پر استعمال ہو تو اس سے''حقیر، کم تر''مراد لیا جاتا ہے۔جیسے آیت زیر مطالعہ میں فرمایا:﴿اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ﴾''کیا تم لینا چاہتے ہو وہ جو کم تر ہے اس کے بدلے جو بہتر ہے۔''

(۴) اگر''اکثر''(زیادہ) کے مقابلے پر استعمال ہو تو اس سے''کم''مراد لیا جاتا ہے۔جیسے فرمایا:﴿وَلَاۤ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾(58/المجادلۃ:7)''اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہی ہوتا ہے خواہ وہ کہیں ہوں۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔

(۵) اگر''اکبر''(بڑا) کے مقابلے پر استعمال ہو اس سے''چھوٹا یا تھوڑا''مراد لیا جاتا ہے۔جیسے فرمایا:﴿وَ

لَنُذِيۡقَنَّهُمۡ مِّنَ الۡعَذَابِ الۡاَدۡنٰى دُوۡنَ الۡعَذَابِ الۡاَكۡبَرِ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۲۱﴾ (32/السجدۃ:21) ''بالیقین ہم انہیں قریب کے چھوٹے سے بعض عذاب اس بڑے عذاب کے سوا چکھائیں گے تا کہ وہ لوٹ آئیں۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔ ''اور ہم ضرور چکھاتے رہیں گے انہیں تھوڑا عذاب بڑے عذاب سے پہلے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

(۲) اَلۡاَدۡنٰى، قرآنِ مجید میں ''دنیا'' کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡكِتٰبَ يَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ هٰذَا الۡاَدۡنٰى وَيَقُوۡلُوۡنَ سَيُغۡفَرُ لَنَا ﴾ (7/الاعراف:169) ''پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ہوئے جو کتاب کے وارث بنائے گئے، وہ لیتے ہیں اِس دنیا کا عارضی سامان اور کہتے ہیں ہمیں بخش دیا جائے گا۔'' اس آیت میں اَلۡاَدۡنٰى کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''لفظ اَدۡنٰى، دُنُوٌّ بمعنی قرب سے بھی مشتق کہا جاسکتا ہے، اِس صورت میں اَدۡنٰى کے معنی اَقۡرَب کے ہوجائیں گے، اسی کا مؤنث دُنۡيَا ہے جس کے معنی قریب کے ہیں، آخرت کے مقابلہ یہ جہان انسان سے زیادہ قریب ہے اس لیے اس کو اَدۡنٰى اور دُنۡيَا کہا جاتا ہے، اور دُوسرا اِحتمال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ دَنَاءَۃ بمعنی ذلت سے مشتق ہو تو اس کے معنی ذلیل وحقیر کے ہوجائیں گے، دنیا اور اس کے سب سامان بمقابلہ آخرت کے حقیر وذلیل ہیں اس لیے اس کو اَدۡنٰى اور دُنۡيَا کہا گیا۔'' (معارف القرآن، ج ۴، ص ۱۰۳)

اَلدُّنۡيَا — لفظ دُنۡيَا دراصل اَفۡعَلُ التَّفۡضِيۡل میں مؤنث کے صیغے فُعۡلٰى کے وزن پر ہے۔ اصل میں دُنۡوٰی بنتا ہے۔ 'وْ' کو 'یْ' میں تبدیل کر کے دُنۡيَا لکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اسے معرّف باللّام اَلدُّنۡيَا استعمال کیا گیا ہے۔ اگر اسے دُنُوٌّ سے مشتق مانا جائے تو پھر اس کا لفظی معنی 'زیادہ نزدیک، زیادہ قریب' بنتا ہے اور اگر اسے دَنَاءَۃٌ سے مشتق مانا جائے تو پھر اس کا معنی 'زیادہ حقیر، زیادہ ذلیل' بنتا ہے۔ اصطلاحاً اس سے مراد زمین اور زمینی زندگی ہے اور یہ لفظ آخرت کے مقابلے پر بولا جاتا ہے۔ ﴿ خَسِرَ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةَ ﴾ (22/الحج:11) ''اس نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی۔'' آخرت کے مقابلے میں اس جہاں کے لیے جب اَدۡنٰى یا دُنۡيَا کا لفظ استعمال ہو تو اس سے دونوں مفہوم مراد لیے جاتے ہیں یعنی یہ جہاں، انسان سے آخرت کے مقابلے میں زیادہ قریب بھی ہے اور اس کا کل سامان آخرت کے مقابلے میں حقیر بھی ہے۔

اگر یہ لفظ ''اَقۡصٰى'' کے مقابلے پر آئے تب بھی اس سے قریب کا مفہوم لیا جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿ اِذۡ اَنۡتُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الۡقُصۡوٰى ﴾ (8/الانفال:42) ''جب تم (مدینے کے) قریب کے ناکے پر تھے اور وہ (کافر) بعید کے ناکے پر۔''

(افعال) اِدۡنَاءٌ — قریب کرنا۔ لپیٹ لینا۔ اس کے ساتھ جب عَلٰى کا صلہ آئے تو مطلب ہوتا ہے اوپر سے لٹکا لینا ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلۡ لِّاَزۡوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ يُدۡنِيۡنَ عَلَيۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِيۡبِهِنَّ ﴾ (33/الاحزاب:59) ''اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔'' اس آیت کے تحت مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''اِدۡنَاء کے اصل معنی قریب کرنے اور لپیٹ لینے کے ہیں، مگر جب اس کے ساتھ عَلٰى کا صلہ آئے تو اس میں اِرۡخَاء یعنی اوپر سے لٹکا لینے کا مفہوم پیدا ہوجاتا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۴، ص:۱۲۹)

خ ی ر: البقرۃ آیت 54 دیکھیں۔ ھ ب ط: البقرۃ آیت 36 دیکھیں۔

م ص ر

(ن) مَصْرًا کوئی سی چیزوں کے درمیان حد ہونا۔
مِصْرٌ اگر معرب ہو تو اس کا مطلب ہے کوئی بھی فصیل والا شہر۔ آیت زیرِ مطالعہ۔
مِصْرُ اگر غیر منصرف ہو تو اس کا مطلب ہے ملک مصر۔ ﴿ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ ﴾(43/الزخرف:51) ''اے میری قوم کیا میرے لیے نہیں ہے مصر کی حکومت/سلطنت۔''

س ء ل

(ف) سُؤَالًا سوال کرنا۔ سوال کرنا کبھی تو کسی سے کوئی چیز مانگنے کے لیے ہوسکتا ہے اور کبھی کسی سے کسی چیز کے بارے میں پوچھنے اور جاننے کے لیے۔ چنانچہ اِس بنیادی مفہوم کے ساتھ یہ لفظ زیادہ تر انہی دو معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) کسی سے کوئی چیز مانگنا یا طلب کرنا۔ اس کے دو مفعول آتے ہیں۔ کس سے مانگا اور کیا مانگا۔ جس سے مانگا جائے وہ مفعول بنفسہٖ آتا ہے اور جو چیز مانگی جائے وہ کبھی بنفسہٖ آتی ہے کبھی مِنْ کے صلے کے ساتھ اور کبھی 'ب' کے صلے کے ساتھ۔ ﴿ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ﴾(33/الاحزاب:53) ''جب تم نبی کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو۔'' ﴿ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ﴾(10/یونس:72) ''تو میں نے نہیں مانگا تم سے کوئی بھی معاوضہ۔'' ﴿ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴾(70/المعارج:1) ''مانگا ایک مانگنے والے نے عذاب پڑنے والا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ''مانگا ایک مانگنے والے نے عذاب کو جو کافروں پر واقع ہونے والا ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔
(۲) کسی سے کسی چیز کے بارے میں پوچھنا۔ جس سے پوچھا جائے وہ مفعول بنفسہٖ آتا ہے۔ اور جس چیز کے بارے میں پوچھا جائے وہ کبھی مفعول بنفسہٖ ہوتا ہے۔ جیسے سَأَلْتُهٗ كَذَا، کبھی عَنْ کے صلے کے ساتھ آتا ہے جیسے سَأَلْتُهٗ عَنْ كَذَا اور کبھی 'ب' کے صلے کے ساتھ جیسے سَأَلْتُهٗ بِكَذَا۔ البتہ عَنْ کا صلہ زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں تینوں طرح استعمال ہوا ہے۔ ﴿ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾(39/الزمر:38) ''اگر آپ اُن سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً وہ یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔ ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ﴾(17/بنی اسرائیل:85) ''اور وہ آپؐ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔'' ﴿ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴾(70/المعارج:1) ''پوچھا ایک پوچھنے والے نے ایک عذاب کے بارے میں جو واقع ہو کر رہے گا۔'' تفسیر ماجدیؒ کے مطابق یہاں بِعَذَابٍ میں 'ب'، 'عَنْ' کے مرادف ہے۔ (واللہ اعلم)۔ تفہیم القرآن اور ضیاء القرآن میں اس آیت میں سَاَلَ کے بارے میں دونوں وضاحتیں لکھ دی گئی ہیں۔ یعنی سَاَلَ کا مفہوم ''مانگنے'' یا ''پوچھنے'' دونوں ہو سکتے ہیں اسی لیے اس آیت کو دونوں جگہ لکھ دیا گیا ہے۔ (واللہ اعلم)۔
سُؤَالٌ بطورِ اسم ذات بھی استعمال ہوتا ہے۔ درخواست۔ مطالبہ۔ سوال۔ ﴿ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ﴾(38/صٓ:24) ''(داؤدؑ) نے کہا کہ اس نے تیری دنبی اپنی دنبیوں میں ملانے کی درخواست کر کے واقعی تجھ پر ظلم کیا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔
سُؤْلٌ اسم ذات ہے۔ درخواست۔ التجا۔ سوال۔ ﴿ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴾(20/طٰہٰ:36) ''جواب ملا منظور کر لی گئی ہے آپؑ کی درخواست اے موسیٰؑ۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

اِسْئَلْ ج: اِسْئَلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو مانگ۔ تو پوچھ۔ قرآن مجید میں یہ زیادہ تر جملے کے درمیان میں مَا قبل سے ملا کر لکھا گیا ہے اور ھمزۃ الوصل گرا کر فَسْئَلْ یا وَسْئَلْ آیا ہے۔ دو جگہ جملہ کے شروع میں آیا ہے وہاں بھی مادہ کا ھمزہ گرا کر صرف سَلْ آیا ہے۔ ﴿وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا﴾ (12/یوسف:82) ''تو آپؑ اُس شہر کے لوگوں سے پوچھ لیں جہاں ہم تھے۔'' ﴿وَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا﴾ (60/ممتحنہ:10) ''اور تم لوگ مانگو جو تم نے خرچ کیا اور چاہیے کہ وہ لوگ مانگیں جو انہوں نے خرچ کیا۔'' ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (16/النحل:43) ''پس تم پوچھو اہل علم سے اگر تم نہیں جانتے۔'' ﴿سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ﴾ (2/البقرہ:211) ''تو پوچھ بنی اسرائیل سے ہم نے دیں ان کو کتنی ہی روشن نشانیاں۔''

سَائِلٌ ج: سَائِلُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ مانگنے والا۔ پوچھنے والا۔ ﴿وَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ (51/الذریات:19) ''اور ان کے اموال میں حق ہے مانگنے والوں کے لیے اور سوال سے بچنے والوں کے لیے۔'' ﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ﴾ (12/یوسف:7) ''یقینا یوسفؑ اور ان کے بھائیوں میں نشانیاں ہیں پوچھنے والوں کے لیے۔''

مَسْئُوْلٌ ج: مَسْئُوْلُوْنَ۔ اسم المفعول ہے۔ جو مانگا جائے۔ جس کے متعلق پوچھا جائے۔ جس سے سوال کیا جائے۔ جس سے پوچھ گچھ کی جائے۔ ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ (17/بنی اسرائیل:36) ''بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی اُس سے پوچھ ہوگی۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ﴾ (37/الصافات:24) ''اور اُن کو (ذرا) ٹھہراؤ اُن سے پوچھ گچھ ہوگی۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔

(تفاعل) تَسَاءُلًا باہم ایک دوسرے سے پوچھنا، مانگنا، سوال کرنا۔ ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ﴾ (78/النبا:1) ''کس چیز کے بارے میں یہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔''

ض ر ب: البقرۃ آیت 26 دیکھیں۔

ذ ل ل

(ض) ذُلًّا، ذِلَّةً، ذَلَالَةً (۱) نرم ہونا، عاجزی کرنا (۲) تابعدار یا مطیع ہونا، جھک جانا (۳) ذلیل وخوار ہونا۔ ﴿لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى﴾ (20/طٰہٰ:134) ''کیوں نہ بھیجا تو نے ہماری طرف کوئی رسول تاکہ ہم پیروی کرتے تیری نشانیوں کی اس سے پہلے کہ ہم ذلیل ہوتے اور رسوا ہوتے۔''

ذُلٌّ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ نرمی۔ تابعداری۔ انکساری۔ عاجزی۔ ﴿وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ (17/بنی اسرائیل:24) ''اور جھکا دو اُن کے لیے تواضع و انکسار کے پَر رحمت (ومحبت) سے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''ذُلٌّ (بضمہ ذال) زور وقہر کی وجہ سے جھکنے کو کہتے ہیں مگر جب طبیعت کی تیزی اور سختی از خود مغلوب ہو جائے تو اسے ذِلٌّ (بکسرۂ ذال) کہا جاتا ہے۔ لہٰذا بنی اسرائیل: ۲۴ کے معنی یہ ہیں کہ ان کے سامنے مقہور و مجبور بن کر رہو۔ اور ایک قراءت میں جَنَاحَ الذِّلِّ (بکسرۂ ذال) ہے یعنی ان کے سامنے نرم خو اور اطاعت گزار بن کر رہا کرو۔'' (مفردات القرآن، ج ۱، ص ۳۶۵)

ذِلَّۃٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ ذلت۔ خواری۔ زیر دستی۔ کمزوری۔ اس کی ضد عِزَّۃٌ ہے جس کے معنی ہیں بالادستی۔ آیت زیر مطالعہ۔

ذَلِیْلٌ ج: اَذِلَّۃٌ۔ فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ اس کی ضد عَزِیْزٌ ہے جس کی جمع اَعِزَّۃٌ ہے۔ قرآنِ مجید میں یہ لفظ مندرجہ ذیل معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(۱) نرم دِل۔ مہربان۔ ﴿اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ﴾ (5/المایدہ:54) ''نرم دل ہیں مسلمانوں پر زبردست ہیں کافروں پر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''ایمان والوں پر وہ مہربان ہوں گے اور کافروں کے مقابلہ میں سخت ہوں گے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(۲) کمزور۔ بے سروسامان۔ ﴿وَلَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّۃٌ﴾ (3/آل عمران:123) ''اور تمہاری مدد کر چکا ہے اللہ بدر کی لڑائی میں اور تم کمزور تھے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''اور یقیناً اللہ نے تمہاری نصرت کی بدر میں حالانکہ تم پست تھے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ حاشیے میں حضرت عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''یعنی تعداد میں قلیل اور سامان میں حقیر۔''

(۳) ذلیل۔ بے عزت۔ ﴿قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً﴾ (27/النمل:34) ''کہنے لگی بادشاہ جب گھستے ہیں کسی بستی میں اس کو خراب کر دیتے ہیں اور کر ڈالتے ہیں وہاں کے سرداروں کو بے عزت۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''وہ بولی کہ بادشاہ جب کسی بستی میں (فاتحانہ) داخل ہوتے ہیں تو اسے تہ و بالا کر دیتے ہیں اور وہاں والوں میں جو عزت دار ہوتے ہیں انہیں وہ ذلیل کر دیتے ہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ﴿لَنُخْرِجَنَّھُمْ مِّنْھَآ اَذِلَّۃً وَّ ھُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ (27/النمل:37) ''اور نکال دیں گے ان کو وہاں سے بے عزت کر کر اور وہ خوار ہوں گے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ ماتحت ہو جائیں گے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔

اردو زبان میں ذلیل کا لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ جبکہ عربی زبان میں، جیسے کہ آپ نے ابھی پڑھا، یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس لفظ کی مزید وضاحت لکھ دی جائے۔ چنانچہ حضرت مولانا امین احسن اصلاحیؒ آل عمران کی آیت 123 کے تحت فرماتے ہیں: ''اَذِلَّۃٌ، ذلیل کی جمع ہے۔ ذلیل عزیز کا مقابل لفظ ہے۔ عزیز کے معنی ہیں غالب، زور آور اور دوسروں کی دسترس سے باہر۔ ذلیل کے معنی کمزور، ناتواں اور دوسروں کے لیے لقمۂ تر کے ہیں اخلاقی رذالت اس لفظ کے بنیادی اجزا میں سے نہیں ہے بلکہ اس کے لوازم بعیدہ میں سے ہے۔ چنانچہ یہ لفظ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً: ﴿اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ﴾ (المائدہ:54) ''وہ مسلمانوں کے لیے نہایت نرم اور کافروں کے لیے نہایت سخت ہیں۔'' یعنی اگر کفار ان کے اندر انگلی دھنسانا اور ان کو اپنے اغراض کے لیے نرم کرنا چاہیں تو وہ پتھر کی چٹان ہیں لیکن مسلمانوں کے لیے نہایت نرم خو ہیں۔ وہ ان سے جس طرح چاہیں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آیت زیر بحث (آل عمران:123) میں بھی یہ لفظ مسلمانوں کی صرف اس وقت کی عددی و مادی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں اخلاقی ضعف و ذلت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ۲، ص ۱۷۰)۔

اور صاحبؒ مترادفات القرآن فرماتے ہیں: ''اَذِلَّۃٌ (ذلیل کی جمع) اس کی ضد اَعِزَّۃ ہے جو عَزِیْز کی جمع ہے۔ ہمارے ہاں عموماً ذلیل کے معنی رذیل، خسیس اور کمینہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور عَزِیْز کے معنی قریبی رشتہ دار۔ یہ دونوں مفہوم لغوی لحاظ سے غلط ہیں۔ حقیقت میں ذلیل کے معنی زیر دست اور عَزِیْز کے معنی بالادست ہیں۔ ذَلِیْل کے مفہوم کا تصور عَزِیْز کے مقابلہ کے بغیر محال ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

ارشادِ باری ہے:﴿ وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ﴾(3/آل عمران:123)''اور اللہ نے جنگِ بدر میں بھی تمہاری مدد کی تھی جبکہ تم کمزور تھے۔''(مترادفات القرآن،ص۵۲۹)۔

اَذَلُّ ج:اَذِلَّوْنَ- اَذِلَّیْنَ- افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔زیادہ کمزور۔زیادہ ذلیل۔﴿ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ﴾ (63/المنافقون:8)''کہتے ہیں البتہ اگر ہم پھر گئے مدینہ کو تو نکال دے گا جس کا زور ہے، وہاں سے کمزور (ذلیل) لوگوں کو۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓىِٕكَ فِی الْاَذَلِّیْنَ ۝۲۰﴾ (58/المجادلۃ:20) ''بے شک جو لوگ مخالفت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی وہ ذلیل ترین لوگوں میں شمار ہوں گے۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)

ذَلُوْلٌ ج: ذُلُلٌ-فَعُوْلٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔تابعدار۔سدھایا ہوا۔پست۔مسخر۔آسان۔فرمانبردار اونٹنی جس پر آسانی اور سہولت سے سواری کی جا سکے،عرب اسے نَاقَةٌ ذَلُوْلٌ کہتے ہیں۔﴿ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ ﴾(2/البقرہ:71)''بے شک وہ ایک گائے ہے،نہیں سدھائی گئی کہ وہ ہل چلائے زمین میں۔''نوٹ کرلیں کہ ذَلُوْلٌ مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔مونث کے لیے 'ۃ' لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی اسی لیے البقرۃ:71 میں بَقَرَةٌ کی صفت کے لیے اس کے ساتھ 'ۃ' نہیں لگائی گئی۔قرآن مجید میں یہ لفظ زمین کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔چنانچہ فرمایا:﴿ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا ﴾(67/الملک:15)''وہ وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔اس صورت میں اس سے مراد ہوتا ہے مسخر کی ہوئی زمین،نرم کی ہوئی زمین یا ہموار کی ہوئی زمین۔ذَلُوْلٌ کی جمع ذُلُلٌ آتی ہے۔چنانچہ فرمایا:﴿ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ﴾(16/النحل:69)''پھر ہر (قسم کے) پھلوں سے (رس) چوستی پھر، پھر اپنے پروردگار کے راستوں میں چل جو تیرے لیے آسان ہیں۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔

(افعال) اِذْلَالًا ذلیل وخوار کرنا۔﴿ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ﴾(3/آل عمران:26)''تو جسے چاہے عزت دے اور تو جسے چاہے ذلت دے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

(تفعیل) تَذْلِیْلًا ذلیل کرنا۔تابع کرنا۔پست کرنا۔اختیار میں کرنا۔﴿ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ ﴾(36/یٰسٓ:72)''اور ہم نے تابعدار بنا دیا انہیں ان کا۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)﴿ وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِیْلًا ﴾(76/الدھر:14)''اور پست کر رکھے ہیں اس کے گچھے لٹکا کر۔''(ترجمہ شیخ الہند)''اور ان کے میوے ان کے بالکل اختیار میں ہوں گے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

س ل ک ن: البقرۃ آیت 35 دیکھیں۔

ب و ء

(ن) بَوْءً لغت میں اس کے تین معنی آتے ہیں۔(۱) لوٹنا۔پھرنا۔(۲) مستحق ہونا۔حق دار ہونا۔(۳) کمانا۔﴿ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ ﴾(3/آل عمران:162)''کیا پس وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے درپے ہے،اس شخص جیسا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی لے کر لوٹتا ہے؟۔''(ترجمہ احسن البیان)۔''کیا جو شخص رضائے الٰہی کا تابع ہے وہ بھلا اس جیسا ہو جائے گا جو غضب الٰہی کا مستحق ہے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔''کیا ایک شخص جو تابع ہے اللہ کی مرضی کا برابر ہو سکتا ہے اُس کے جس نے کمایا غصہ اللہ کا۔''(ترجمہ شیخ الہند)۔آیت زیر مطالعہ میں بھی بَآءُوْ کا ترجمہ پہلے اور

دوسرے معنی کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔﴿ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ ﴾(5/المائدۃ:29)''میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تو لوٹے میرے قتل کے گناہ اور اپنے پچھلے گناہ کے ساتھ۔''

(تفعیل) تَبْوِیَۃٌ کسی کو ٹھکانا دینا۔ کسی مناسب مقام کا تعین کرنا۔ جگہ مقرر کرنا۔﴿ وَ الَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا فِی اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا لَنُبَوِّئَنَّهُمۡ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً ؕ ﴾(16/النحل:41)''اور جن لوگوں نے اللہ کے واسطے ہجرت کی بعد اس کے کہ اُن پر ظلم ہو چکا تھا ہم اُن کو دنیا میں بھی بہت اچھا ٹھکانا دیں گے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔﴿ وَ اِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰهِیۡمَ مَکَانَ الۡبَیۡتِ ﴾(22/الحج:26)''اور یاد کرو جب ہم نے مقرر کر دی ابراہیمؑ کے لیے اس گھر کے (تعمیر کرنے) کی جگہ۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔﴿ وَ اِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِکَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ ﴾(3/آل عمران:121)''اور یاد کرو (اے محبوبؐ) جب صبح سویرے رخصت ہوئے آپؐ اپنے گھروں سے (اور میدانِ اُحد میں) بٹھا رہے تھے مومنوں کو مورچوں پر جنگ کے لیے۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔

مُبَوَّءٌ اسم المفعول ہے جو ظرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ٹھکانہ۔ اقامت کی جگہ۔﴿ وَ لَقَدۡ بَوَّاۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مُبَوَّاَ صِدۡقٍ ﴾(10/یونس:93)''اور یقیناً ہم نے ٹھکانہ دیا بنی اسرائیل کو، سچائی کا ٹھکانہ (یعنی بہترین ٹھکانہ)۔''

(تفعّل) تَبَوُّءٌ اقامت اختیار کرنا۔﴿ وَ کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنۡهَا حَیۡثُ یَشَآءُ ؕ ﴾(12/یوسف:56)''اور اس طرح ہم نے اختیار دیا یوسفؑ کو اس زمین میں یعنی ملکِ مصر میں کہ وہ اقامت اختیار کریں اس میں جہاں وہ چاہیں۔'' حدیث مبارک میں فرمایا: مَنۡ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلۡیَتَبَوَّأۡ مَقۡعَدَہٗ مِنَ النَّارِ ''جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ لگائے اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنالے۔''(بحوالہ مفردات القرآن ج۱،ص۱۲۹)

غ ض ب: الفاتحہ آیت 7 دیکھیں۔	ء ل ہ: آیت بسم اللہ دیکھیں۔	ك و ن: البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔
ك ف ر: البقرۃ آیت 6 دیکھیں۔	ق ت ل: البقرۃ آیت 54 دیکھیں۔	

ن ب و

(ن) نَبُوَّۃٌ بلند و بالا ہونا۔

نَبِیٌّ ج: نَبِیُّوۡنَ اور اَنۡبِیَاءُ۔ فَعِیۡلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بلند و بالا۔ اعلیٰ و ارفع۔ نبی کو نبی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ لوگوں میں معزز اور بلند اقدار کا حامل ہوتا ہے۔﴿ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ۟ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ﴿ۙ۳۰﴾ ﴾(19/مریم:30)''بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے دی مجھے کتاب اور اس نے بنایا مجھے نبی۔''﴿ وَ مَاۤ اُوۡتِیَ النَّبِیُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ ﴾(2/البقرۃ:136)''اور جو دیا گیا نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔''﴿ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ ﴾(2/البقرہ:91)''تو کیوں تم لوگ قتل کرتے تھے اللہ کے نبیوں کو اس سے پہلے۔'' مولانا مودودیؒ نَبِیٌّ کے لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: '''نَبِیٌّ' کے معنی میں اہل لغت کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اس کو لفظ نَبَأ سے مشتق قرار دیتے ہیں جس کے معنی خبر کے ہیں، اور اس اصل کے لحاظ سے نبی کے معنی ''خبر دینے والے'' کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ نَبُو ہے، یعنی رفعت اور بلندی۔ اور اس معنی کے لحاظ سے نبی کا مطلب ہے ''بلند مرتبہ'' اور ''عالی مقام'' ازہری نے کسائی سے ایک تیسرا قول بھی نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ لفظ دراصل نبیٔ ہے جس کے معنی طریق اور راستے کے ہیں اور انبیاء کو نبی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف جانے کا راستہ ہیں۔ پس کسی شخص کو

''رسول نبی'' کہنے کا مطلب یا تو ''عالی مقام پیغمبر'' ہے یا ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبریں دینے والا پیغمبر'' یا پھر ''وہ پیغمبر جو اللہ کا راستہ بتانے والا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۳،ص ۷۲)۔ البتہ نوٹ کر لیجئے کہ قرآن مجید میں کسی نبی کے لیے نَبِیْءٌ کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ نَبِیٌّ آیا ہے۔ خود حضورؐ نے بھی اپنے لیے نَبِیٌّ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ایک مرتبہ کسی نے حضورؐ کو خطاب کر کے کہا یَا نَبِیْءَ اللّٰہِ، تو آپؐ نے ان کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا: ''لَسْتُ بِنَبِیْءِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ نَبِیُّ اللّٰہِ۔'' اب عربی میں نَبِیْءٌ کا لفظ جھوٹے مدعی نبوت کے لیے آتا ہے۔ جیسے تَنَبَّأَ مُسَیْلَمَۃُ (جھوٹا دعویٰ نبوت کیا مسیلمہ نے)۔

نُبُوَّۃٌ اسم ذات ہے۔ بلندی۔ سرفرازی۔ نبوت۔ نبوت کے اصطلاحی معنی ہیں لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو پیغمبری ملنا۔ ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ﴾ (6/الانعام:89) ''یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے دی کتاب اور حکم اور نبوت۔''

غَیْرُ: الفاتحہ آیت 7 دیکھیں۔ ح ق ق: البقرۃ آیت 26 دیکھیں۔

ع ص ی

(ض) **عِصْیَانًا، عَصْیًا** اور **مَعْصِیَۃً** حکم عدولی کرنا۔ نافرمانی کرنا۔ اطاعت سے نکل جانا۔ ﴿فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ﴾ (73/المزمل:16) ''پس نافرمانی کی فرعون نے رسول کی۔'' ﴿فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝﴾ (14/ابراہیم:36) ''پس جس نے پیروی کی میری تو بے شک وہ مجھ سے ہے اور جس نے نافرمانی کی میری تو یقیناً تو بے انتہا بخشنے والا، ہر حال میں رحم کرنے والا ہے۔'' ﴿لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ﴾ (66/التحریم:6) ''نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جس کا اُس نے اُنہیں حکم دیا۔''

یَعْصِ مضارع مجزوم ہے۔ ﴿مَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا ۝﴾ (33/الاحزاب:36) ''اور جو نافرمانی کرتا ہے اللہ کی اور اس کے رسول کی تو وہ بھٹک گیا کھلی گمراہی میں۔''

عَصِیٌّ فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت مشبہ یا مبالغے کا صیغہ ہے۔ بڑا نافرمان۔ بہت حکم عدولی کرنے والا (اس میں ہمیشہ یا مسلسل نافرمانی کرنے کا مفہوم ہے)۔ ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا ۝﴾ (19/مریم:44) ''بے شک شیطان رحمٰن کا بڑا نافرمان ہے۔''

مَعْصِیَۃٌ مصدر میمی بھی ہے اور اسم بھی۔ مطلب ہے نافرمانی کرنا۔ اور نافرمانی، حکم عدولی۔ ﴿فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ﴾ (58/المجادلہ:9) ''تو تم لوگ باہم مشورہ مت کرو گناہ کا اور سرکشی کا اور ان رسولؐ کی نافرمانی کا۔''

عِصْیَانٌ مصدر کے علاوہ بطور اسم بھی استعمال ہوتا ہے۔ نافرمانی۔ گناہ۔ یہ لفظ اطاعت کی ضد ہے۔ ﴿وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ ؕ﴾ (49/الحجرات:7) ''اور قابل نفرت بنا دیا ہے تمہارے نزدیک کفر، فسق اور نافرمانی کو۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

ع د و: البقرۃ آیت 36 دیکھیں۔

ترکیب 'وٗ' عطف کا ہے اور اِذْ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے اُذْکُرُوْا محذوف ہے۔ قُلْتُمْ ماضی میں جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ یٰمُوْسٰی میں، یَا حرف نداء ہے اور موسیٰؑ منادٰی۔ لَنْ نواصب مضارع میں سے ہے اسی لیے نَصْبِرَ حالت نصب میں ہے اور مضارع پر داخل ہو تو مستقبل میں زور دار نفی کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ متعلق ہے نَصْبِرَ کے۔ طَعَامٍ وَّاحِدٍ مرکب توصیفی ہے۔ فَادْعُ میں 'ف' استئنافیہ ہے۔ اُدْعُ فعل امر ہے۔ لَنَا متعلق فعل ہے اور رَبَّكَ مفعول ہے۔ اُدْعُ کا جواب امر ہونے کی وجہ سے یُخْرِجْ مجزوم ہوا ہے۔ لَنَا متعلق فعل ہے۔ مِمَّا مرکب ہے۔ مِنْ حرف جر اور 'مَا' اسم موصول کا۔ تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ جملہ فعلیہ صلہ ہے 'مَا' موصول کا اس میں تُنْۢبِتُ فعل ہے اور الْاَرْضُ اس کا فاعل ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے یعنی مِمَّا تُنْۢبِتُهُ الْاَرْضُ، صلہ اور موصول مل کر حالت جر میں ہیں مِنْ کی وجہ سے اور جار مجرور مل کر متعلق ہیں یُخْرِجْ سے۔ مِنْۢ بَقْلِهَا میں 'مِنْ' بیانیہ ہے جو تفصیل یا وضاحت کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ مِمَّا میں اسم موصول 'مَا' کی وضاحت کر رہا ہے۔ بَقْلِهَا سے بَصَلِهَا تک سارے مرکب اضافی ہیں۔ سارے مضاف مِنْ کی وجہ سے حالت جر میں ہیں اور 'هَا' ضمیریں، اَلْاَرْضُ کے لیے ہیں۔ قَالَ، ماضی میں واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ میں 'اَ' استفہامیہ ہے۔ تَسْتَبْدِلُوْنَ مضارع میں جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر اَنْتُمْ ہے۔ اَلَّذِیْ۔ اسم موصول ہے اور آگے جملہ اسمیہ هُوَ اَدْنٰی اس کا صلہ ہے اور صلہ اور موصول مل کر مفعول ہیں تَسْتَبْدِلُوْنَ کا۔ یعنی یہ وہ چیز ہے جو چاہی جا رہی ہے اور آگے 'ب' صلے کے ساتھ اس چیز کا ذکر ہے جس کے بدلے میں چاہی جا رہی ہے۔ چنانچہ بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ میں 'ب' حرف جر ہے اَلَّذِیْ اسم موصول اور جملہ اسمیہ هُوَ خَیْرٌ اس کا صلہ ہے۔ اور صلہ اور موصول مل کر مجرور ہیں 'ب' کی وجہ سے۔ اِهْبِطُوْا۔ فعل امر ہے اور مِصْرًا مفعول بہٖ ہے۔ فَاِنَّ میں 'ف' استئنافیہ ہے۔ اِنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے۔ 'مَا' اسم موصول اور سَاَلْتُمْ جملہ فعلیہ اس کا صلہ۔ صلہ اور موصول مل کر اِنَّ کا اسم ہے۔ اِس کی خبر محذوف ہے اور لَكُمْ قائم مقام خبر مقدم ہے۔ وَضُرِبَتْ میں 'وٗ' استئنافیہ ہے۔ ضُرِبَتْ فعل مجہول ہے۔ عَلَيْهِمُ متعلق فعل ہے اور اَلذِّلَّةُ اور اَلْمَسْكَنَةُ نائب الفاعل ہیں۔ بَآءُوْ جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اس کے واؤ الجمع کا الف خلاف قاعدہ گرا ہوا ہے۔ آگے بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ اس سے متعلق ہے۔ ذٰلِكَ۔ مبتدا ہے اور اس سے ذلت اور مسکنت کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے اور بِاَنَّهُمْ سے شروع ہونے والا جملہ متعلق خبر ہے جو کہ اب قائم مقام خبر ہوگا۔ بِاَنَّهُمْ میں 'ب' سببیہ ہے۔ اَنَّ۔ حرف مشبہ بالفعل ہے۔ هُمْ اس کا اسم اور جملہ فعلیہ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اس کی خبر ہے۔ آگے 'وٗ' عطف کا ہے اور جملہ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ، جملہ ماقبل پر عطف ہے۔ آگے ذٰلِكَ۔ مبتدا ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے بِمَا سے شروع ہونے والا جملہ متعلق خبر ہے۔ جو کہ اب قائم مقام خبر ہوگا۔ بِمَا میں 'ب' سببیہ ہے۔ 'مَا' مصدریہ ہے جس نے اگلے فعل کے ساتھ مل کر مصدری معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ یہاں ذٰلِكَ کا اشارہ بھی ذلت اور مسکنت کی طرف ہے۔ آگے 'وٗ' عطف کا ہے، كَانَ کا اسم اس میں شامل ضمیر ہے اور جملہ فعلیہ يَعْتَدُوْنَ، كَانَ کی خبر ہے۔ اس جملے میں بھی 'مَا' مصدریہ کی وجہ سے مصدری معنی پیدا ہو گئے ہیں اور یہ جملہ اِن معنوں میں ہے ذٰلِكَ بِعِصْيَانِهِمْ وَ بِكَوْنِهِمْ يَعْتَدُوْنَ۔ (واللّٰہ اعلم)۔

ترجمہ
البقرۃ:61

وَاِذْ قُلْتُمْ	يٰمُوْسٰى	لَنْ نَّصْبِرَ	عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ
اور (یاد کرو) جب کہا تم نے	اے موسیٰؑ	ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے	ایک ہی طرح کے کھانے پر

فَادْعُ	لَنَا	رَبَّكَ	يُخْرِجْ لَنَا	مِمَّا
پس آپؑ پکاریئے	ہمارے لیے	اپنے رب کو	کہ وہ نکالے ہمارے لیے	اس میں سے جو

تُنْۢبِتُ	الْاَرْضُ	مِنْۢ	بَقْلِهَا	وَقِثَّآئِهَا	وَفُوْمِهَا
اُگاتی ہے	زمین	جیسے کہ	اس کی سبزی	اور اس کی ککڑی	اور اس کی گندم/لہسن

وَعَدَسِهَا	وَبَصَلِهَا ؕ	قَالَ	اَتَسْتَبْدِلُوْنَ
اوراس کی مسور	اوراس کا پیاز	انہوںؑ نے کہا	کیاتم تبدیلی میں چاہتے ہو

الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی	بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ	اِهْبِطُوْا	مِصْرًا	فَاِنَّ
اس کوجوکمتر ہے	اس کے بدلے جوبہتر ہے	تم اترو	کسی شہر میں	تو یقیناً

لَكُمْ	مَّا سَاَلْتُمْ ؕ	وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ	الذِّلَّةُ	وَالْمَسْكَنَةُ ۗ
تمہارے لیے ہے	وہ جوتم نے مانگا	اوران پرتھوپ دی گئی	ذلت	اورمحتاجی

وَبَآءُوْ	بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ	ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
اوروہ لوگ لوٹے/مستحق ہوگئے	اللہ کے غضب کے ساتھ/ اللہ کے غضب کے	یہ اس لیے کہ وہ

كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ	بِاٰیٰتِ اللّٰهِ	وَیَقْتُلُوْنَ	النَّبِیّٖنَ	بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ
انکارکیا کرتے تھے	اللہ کی آیات کا	اورقتل کیا کرتے تھے	نبیوں کو	ناحق

ذٰلِكَ بِمَا	عَصَوْا	وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ
یہ اس سبب سے جو	انہوں نے نافرمانی کی	اور جووہ حد سے تجاوز کیا کرتے تھے

نوٹ آیت کی ترکیب میں آپ کو بتایا گیا ہے کہ لفظ بَآءُوْ میں الف خلافِ قاعدہ محذوف ہے۔اس مسئلہ کو سمجھ لیں۔ابتداءً جب قرآن مجید لکھا گیا تو کچھ الفاظ اس طرح نہیں لکھے گئے جیسے عام عربی میں لکھے جاتے ہیں۔مثلاً صَلٰوۃٌ کے بجائے صَلٰوۃٌ۔ اسی طرح واوالجمع کا لفظ بعض مقامات پر یا تو خلافِ قاعدہ لکھا گیا ہے یا محذوف ہے۔اب یہ تحقیق وتفتیش کہ ایسا کیوں ہوا، ایک ایسی سعی ہے جس کا حاصل کچھ نہیں ہے۔البتہ اس حوالے سے جو بات سمجھنے اور ذہن نشین کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ابتداء قرآن مجید جس طرح لکھا گیا تھا، آج تک اسے اسی طرح لکھا جارہا ہے (اسے رسم عثمانی کہا جاتا ہے)۔ اصول یہ ہے کہ قرآن مجید میں جس مقام پر جو لفظ جس طرح لکھا ہے، اس مقام پر وہی قرآن کا درست املا ہے۔کسی لفظ کو مروجہ عربی کے مطابق لکھنا یا کسی خلافِ قاعدہ لفظ کو درست کر کے قاعدے کے مطابق لکھنا قرآن مجید کا غلط املا شمار کیا جاتا ہے۔جیسے تَتَنَزَّلُ اور تَذَكَّرُوْنَ ایک ہی لفظ ہے اور اسے دونوں طرح لکھنا درست ہے۔لیکن قرآن مجید میں جس مقام پر تَتَنَزَّلُ لکھا ہے وہاں تَذَكَّرُوْنَ لکھنا اور پڑھنا غلط ہے اور جہاں تَذَكَّرُوْنَ لکھا ہے وہاں تَتَنَزَّلُ لکھنا اور پڑھنا غلط ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے بزرگوں کے درجات بلند فرمائے جنہوں نے اتنے غیر لچکدار (RIGID) اصول وضع کر کے قرآن مجید کو تحریف سے محفوظ رکھنے کا انتظام کیا۔(از لطف الرحمٰن خان صاحب)